رسول اللہ صلعم کے حالات وغزوات، اخلاق وعادات اور تعلیم وارشاد کا یہ عظیم الشان کتابی ذخیرہ جس کا نام سیرۃ النبی عام طور سے مشہور ہے مسلمانوں کے موجودہ ضروریات کو سامنے رکھکر صحت واہتمام کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے۔

اب تک اس کتاب کے چھ حصے شائع ہو چکے ہیں، پہلے میں ولادت سے لیکر فتح مکہ تک کے حالات اور غزوات ہیں، اور ابتدا میں ایک نہایت مفصل مقدمہ لکھا گیا ہے جس میں فن سیرت کی تنقید و تاریخ ہے دوسرے حصہ میں تکمیل دین، تاسیس حکومت الٰہی، وفات، اخلاق وعادات، اعمال وعبادات اور اہلبیت کرام کے سوانح کا مفصل بیان ہے، تیسرے حصہ میں آپ کے معجزات وخصائص نبوت پر بحث ہے، اسمیں سب سے پہلے عقلی حیثیت سے معجزات پر متعدد اصولی بحثیں کیگئی ہیں، پھر ان معجزات کی تفصیل ہے جو بروایات صحیح ثابت ہیں اسکے بعد ان معجزات کے متعلق غلط روایات کی تنقید وتفصیل کیگئی ہے، چوتھے حصہ میں ان اسلامی عقائد کی تشریح ہے جو آپ کے ذریعہ مسلمانوں کو تعلیم کئے گئے ہیں، کوشش کی گئی ہے کہ اس میں قرآن پاک اور احادیث صحیحہ سے اسلام کے عقائد لکھے جائیں، پانچویں حصہ میں عبادت کی حقیقت، عبادات کی تفصیل وتشریح اور ان کے مصالح وحکم کا بیان ہے اور دوسرے مذاہب کی عبادات سے ان کا مقابلہ وموازنہ ہے، چھٹے حصہ میں حقوق، فضائل، اور آداب کے عنوانوں اور اسکی ذیلی سرخیوں کے تحت، اخلاقی تعلیمات کی تفصیل ہے، حجم ۶۱۲ صفحے،

قیمت باختلاف کاغذ حصہ اول تقطیع خورد للعہ، حصہ دوم تقطیع کلاں ۶ تقطیع خورد ۵ روپیہ،
حصہ سوم تقطیع کلاں ۶ روللعہ تقطیع خورد معہ و صہ، حصہ چہارم تقطیع کلاں عہ روپیہ تقطیع خورد عہ صہ،
حصہ پنجم تقطیع کلاں صہ روللعہ تقطیع خورد صہ روپیہ، حصہ ششم تقطیع کلاں قسم اول صہ قسم دوم للعہ،

(منیجر دار المصنفین - اعظم گڈھ)

دائرۃ المعارف

یعنی

معارف اعظم گڈھ

کی

۴۶ ویں جلد

از جولائی سنہ ۱۹۴۰ء تا دسمبر ۱۹۴۰ء

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

مطبوعہ معارف پریس اعظم گڈھ

فہرست مضمون نگارانِ معارف

جلد ۴۶

جولائی سنہ ۱۹۴۰ء تا دسمبر ۱۹۴۰ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

فہرست مضامین

جلد ۴۶

جولائی سنہ ۱۹۴۰ء تا دسمبر سنہ ۱۹۴۰ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

"جلد ۴۶" ماہ جمادی الاول ۱۳۵۹ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۴۰ء "عدد ۱"

مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

پچھلے مہینہ ملک میں کئی افسوسناک موتیں ہوئیں، یمین السلطنة مہاراجہ سرکرشن پرشاد جنھوں نے پورے ۳۷ برس تک دکن کے سیاسی و انتظامی معاملات کی سربراہی کی، وفات پائی، ۱۹۰۲ء میں وہ دولت آصفیہ کے پیشکار و صدر اعظم مقرر ہوئے، اور تھوڑے تھوڑے وقفہ کے ساتھ برابر اپنے عہدہ پر فائز رہے، وہ راجہ ٹوڈرمل کی یادگار تھے، اصلی وطن لاہور اور پھر دہلی ہوا، اور یہاں سے آصفجاہ اول کے ساتھ ان کا خاندان دکن کو منتقل ہوا، اور ہمیشہ شاہان آصفیہ کے سیاسی و مالی مہمات میں کارپرداز بنا رہا،

مہاراجہ سرکشن پرشاد عربی، فارسی اور انگریزی تین زبانوں سے واقف تھے اور تینوں میں باتیں کرتے تھے، علمی مذاق صاف ستھرا تھا، شعر و سخن کا چسکا رکھتے تھے، تصوف میں وحدۃ الوجود کے عقیدہ کے نہایت سخت معتقد اور حامی تھے، اور اسی کو ہندو مسلم اتحاد کا ذریعہ سمجھتے تھے، سرکار رسالت صلعم کی بارگاہ میں بھی کبھی کبھی عقیدت کا اظہار کرتے تھے، ان کی ایک نعت کو یہ شرف حاصل ہے کہ مدینہ منورہ میں مسجد نبویؐ کے پیچھے کتبخانہ شیخ الاسلام کی ایک دیوار پر آویزاں ہے، مرنج و مرنجان، شریف، وضعدار، اور پرانی شریفانہ خصوصیات کی اپنی آپ مثال تھے،

حیدرآباد میں اودھ کے ایک مشہور و ممتاز مینائی خاندان کے فرد فرید نے بھی ہماری دنیائے فانی کو الوداع کہا، منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی کے خلف الرشید نواب اختر یار جنگ بہادر جنھوں نے دکن میں امیر مرحوم کی وفات کے بعد سے دکن کو شاہِ دکن کی نوازشوں سے اپنا وطن بنا لیا تھا، اور معتمد امور مذہبی کی حیثیت سے سینکڑوں مفید خدمات انجام دیئے اور ہر نیک کام کی امداد میں سبقت کی، اور اب چند سال سے پنشن پاکر عزلت کی زندگی بسر کر رہے تھے، ہمیشہ کے لئے بزم حیات سے رخصت ہو گئے، اللہ تعالیٰ ان کے نیک خدمات کا نیک صلہ عنایت فرمائے،

خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنؤ داروغہ حیدر بخش کی مسجد کے نیچے کتابوں کی ایک چھوٹی سی دوکان پر بیٹھا کرتے تھے، مگر خدا جانے کیا بات ہے یہ چھوٹی سی معمولی حیثیت کی دوکان نصف صدی تک لکھنؤ کے اہل علم و ادب کا مرکز بنی رہی، اور ہمیں نے بھی چالیس برس اس چھوٹی سی دکان کو اسی طرح علم و ادب کے قدر شناسوں کا مرکز دیکھا، اس وقت جب لکھنؤ کا چوک بجلی اور گیس کی روشنیوں سے جگمگا رہا تھا یہی دکان تھی جس پر پرانا مٹی کا چراغ جلا کرتا تھا، اور دنیا کو وضعداری کی روشنی دکھاتا تھا، افسوس کہ زبان و ادب کا یہ ٹمٹماتا ہوا چراغ بھی بجھ گیا،

خواجہ صاحب گو خود غیر معمولی شاعر نہ تھے، مگر لکھنؤ کے بڑے بڑے شاعروں کی صحبت اٹھائے تھے، ہجر مرحوم کے شاگرد تھے، نظم سے زیادہ نثر لکھتے تھے اور لکھنؤ کی راجدھانی اور لکھنؤ کے جانِ عالم کی کہانی ان کا خاص موضوع تھا، لکھنؤ کی بول چال اور محاوروں اور روزمرہ کو بخوبی برتتے تھے، نیک مزاج، وضعدار اور قناعت پسند تھے، اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے،

بھوپال سے مفتی محمد انوار الحق صاحب ایم اے سابق وزیر تعلیم وحال وزیر مالیات بھوپال کی وفات کی افسوسناک خبر آئی ہے، موصوف صاحبِ علم اور محبِ دین تھے، ان کے قلمی خدمات اور تحریری مجاہدات بھی خاص ذکر کے قابل ہیں، تاریخ ابو البشر، اثباتِ واجب الوجود اور دوسری مذہبی کتابیں جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے بہت مفید ثابت ہوئیں، عمر بھر علمی وتعلیمی کاموں کی مشغولیت کے باوجود اخیر عمر میں سرکار بھوپال کے مالیات کے صیغہ کو جس خوبی سے سنبھالا دوست ودشمن ہر ایک نے اس کی تحسین کی، اللہ تعالیٰ اپنے خزانۂ رحمت سے اس علم وعمل کے مجسمہ کو سرفراز فرمائے،

فتنۂ نگار کے پچھلے ہنگامہ کو ابھی چند ہی سال گذرے ہوں گے، جب مہدی مرحوم کی زبان میں ایک "کافرِ ادب" نے اپنے دوبارہ ایمان اور توبہ وبازگشت کا اعلان کیا تھا، اور وعدہ کیا تھا کہ وہ آیندہ اس قسم کے مضامین سے پرہیز کرینگے اور اللہ تعالیٰ، رسولؐ اور ائمہ کے خلاف کچھ نہیں لکھینگے، یہ وعدہ کم از کم ایک شریف انسان کا وعدہ تو ثابت ہوتا، لیکن افسوس کہ اس حیثیت سے بھی متوقع معیار پورا نہ ہو سکا، اس وعدہ کے کچھ ہی دنوں کے بعد سے وہ پھر اسی قسم کی جاہلانہ تحریروں کی اشاعت میں معروف ہیں، اور اب انتہا یہ ہے کہ جون نمبر میں علی الاعلان قرآن پاک کے من جانب اللہ اور کلام الٰہی اور وحی ربانی ہونے سے انکار کیا گیا ہے، قربان جائیے مسلمان نوجوانوں کی بے تعصبی کے کہ اس تحریر کا لکھنے والا اب تک مسلمان سمجھا جاتا ہے اور شاید وہ خود بھی اپنے کو مسلمان سمجھنے پر مصر ہو، دیکھنا ہے کہ اس زمانہ کے بت شکن مجاہدینِ قلم اس نئی بنائے کفر والحاد کے توڑنے میں کس کس طرح قوت صرف فرماتے ہیں، اور مسلمان اپنی دینی غیرت وحمیت کا کیا ثبوت دیتے ہیں ؟

مقالات

فہم قرآن کے اصول وشرائط

از

شاہ معین الدین احمد ندوی

کلام اللہ کی اہمیت اور اسکی خصوصیات

قرآن پاک خدا کی آخری کتاب ہے، جو خاتم الانبیاء کے ذریعہ، سارے عالم کی دائمی رہنمائی کے لئے بھیجی گئی، آسمانی صحیفوں میں یہ امتیاز وخصوصیت صرف کلام مجید کو حاصل ہے کہ وہ تنہا اخلاق وروحانیت کا درس اور نجاتِ اُخروی کا نسخہ نہیں ہے بلکہ دین کے ساتھ وہ مسلمانوں کی دنیاوی کامرانیوں کا دستور العمل بھی ہے،

رسول اللہ صلعم کی بعثت کا مقصد اسی پیام الٰہی کی تبلیغ اور اس کا قیام تھا، اس لئے آغازِ وحی میں "بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ" اور "فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ" کے احکام ملے،

اس قانون کی بقا وتحفظ پر ساری دنیا کی ہدایت اور ایک برگزیدۂ امم قوم کی جو دنیا کے لئے نمونہ بنا کر بھیجی گئی موت وحیات کا دار ومدار تھا، اس لئے خدا نے خود اسکی حفاظت کا ذمہ لیا،

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ — بیشک ہم نے یہ نصیحت اتاری ہے اور ہم اسکی حفاظت کرنے والے ہیں،

اور رسول نے اس کے ایک ایک حکم اور ایک ایک آیت کی تشریح کی، اس کے قوانین وتعلیمات کو

عملاً برت کر دکھایا اور اپنے بعد اپنی تعلیم دی ہوئی حاملِ قرآن جماعت چھوڑ گیا کہ قرآن کی تعلیم کا کوئی پہلو تشنہ باقی نہ رہنے پائے،

رسول اللہ صلعم کے بعد صحابۂ کرام، تابعین، و تبع تابعین عظام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اسی نورِ نبوت کی روشنی میں قرآن کو سمجھتے اور دنیا کے سامنے پیش کرتے رہے، اور علماء اسلام قرآن پاک کے ہر جزی سے جزی پہلو پر تحقیق کا اتنا عظیم الشان ذخیرہ چھوڑ گئے جس کی مثال مذاہب عالم کی تاریخ میں نہیں ملسکتی،

کلام اللہ آسان بھی ہے اور مشکل بھی

کلام اللہ جاہل بدؤن اور حکماء و فلاسفہ دونوں کی رہنمائی کے لئے آیا تھا، اس لئے اس میں بقدر عقل صاف و سادہ تعلیمات بھی ہین جنھین ہر بدوی سمجھ سکتا ہے اور حکماء کے غور و فکر کیلئے اسرار و حکم اور امثال و مواعظ بھی ہیں، اس لئے قرآن آسان بھی ہے اور مشکل بھی،

قرآن آسان ہے،

فَاِنَّمَا يَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ، (دخان-۳)

بیشک ہم نے اس کو (قرآن) تمھاری زبان میں آسان کر دیا تاکہ لوگ نصیحت حاصل کریں

فَاِنَّمَا يَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا، (مریم-۲)

بیشک ہم نے اسکو (قرآن) تمھاری زبان میں آسان کر دیا تاکہ تم اس کے ذریعہ پرہیزگاروں کو بشارت دو اور جھگڑالو قوم کو ڈراؤ،

قرآن مشکل ہے،

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ

اسی خدانے تم پر کتاب اتاری، اسکی بعض

مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ، (آل عمران-۱)

آیتین محکمات (آسان و واضح) ہیں یہی اصل کتاب ہیں اور دوسری متشابہات ہیں (جن کے کئی پہلو ہیں)

اس کی تاویل صرف خدا جانتا ہے یا راسخون فی العلم،

وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا، (آل عمران-۱)

اور اس کی تاویل کو صرف خدا جانتا ہو اور راسخون فی العلم کہتے ہیں کہ ہم ہر اس چیز پر ایمان لائے جو ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے،

اگرچہ اس آیت کے معنی میں مفسرین کا اختلاف ہے، زیادہ لوگ وما یعلم تاویلہ الا اللہ کو الگ ایک جملہ مانتے ہین اور مابعد سے اسے متعلق نہیں کرتے، اس صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ متشابہات کی تاویل سوائے خدا کے کوئی نہیں جانتا، راسخون فی العلم اسکی بحث و تحقیق میں نہیں پڑتے اور کہتے ہیں کہ خدا کی جانب سے جو کچھ بھی ہے خواہ وہ محکمات ہون یا متشابہات ہون ہم سب پر بے چون و چرا ایمان لائے، لیکن ایک جماعت والراسخون فی العلم کا عطف سابق جملہ پر مانتی ہے، اس صورت میں یہ معنی ہون گے کہ متشابہات کی تاویل خدا جانتا ہے، اور راسخون فی العلم جانتے ہیں،

بہرحال اگر یہ معنی نہ بھی لئے جائیں تو قرآن کو سمجھنے کے لئے علم، عقل اور فہم و تدبر کی ضرورت ہے، قرآن پاک مین بکثرت ان چیزوں پر زور دیا گیا ہے،

اس کے امثال و حکم سے عبرت و بصیرت حاصل کرنے کے لئے عقل و دانش کی ضرورت ہے،

كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ

اسی طرح ہم ان لوگوں کے لئے آیات کی

يَعْقِلُوْنَ ، (روم - ۴) — تفصیل بیان کرتے ہیں جو سوچتے سمجھتے ہیں

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ — اس میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں

يَّعْقِلُوْنَ ، (روم - ۳) — جو سوچتے سمجھتے ہیں،

علم کی ضرورت ہے،

تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ — یہ مثالیں ہم لوگوں کے لئے بیان کرتے ہیں

وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ، — جنھیں صرف علم رکھنے والے سمجھتے ہیں،

فکر و تدبر کی ضرورت ہے،

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ — بیشک اس میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں

يَّتَفَكَّرُوْنَ ، (روم) — ہیں جو غور و فکر کرتے ہیں،

كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ — ہم ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرتے ہیں

يَّتَفَكَّرُوْنَ ، (یونس - ۳) — اسی طریقہ سے آیات کی تفصیل کرتے ہیں،

تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ — یہ مثالیں ہم ان لوگوں کے لئے بیان کرتے

لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ، (حشر - ۳) — ہیں جو غور و فکر کرتے ہیں،

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ — ہم نے تمہاری طرف مبارک کتاب اتاری

لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ — کہ لوگ اس کی آیتوں پر غور و فکر کریں،

اُولُوا الْاَلْبَابِ ، (ص - ۳) — اور عقل والے نصیحت حاصل کریں،

ان آیات سے معلوم ہوا کہ قرآن کے تنہا لفظی معنی سمجھ لینا کافی نہیں ہے کہ اسے ہر بدوی سمجھتا تھا بلکہ ان پر غور و فکر اور تدبر کی ضرورت ہے،

قرآن کی تعلیم کی ترغیب اس لئے رسول اللہ صلعم تعلیم قرآن کی ترغیب دلائی،

انّ افضلکم من تعلم القرآن و — تم میں فضل وہ ہے جس نے خود قرآن کی تعلیم

علمہ (بخاری و ترمذی و ابن ماجہ) — حاصل کی اور دوسروں کو تعلیم دی،

قرآن کی تعلیم و تعلم کی یہ تمثیل بیان فرمائی،

تعلموا القرآن و اقرأوہ فانّ — قرآن کو سیکھو اور دوسروں کو سکھاؤ کیونکہ

مثل القرآن و من تعلمہ فقام — جس نے قرآن سیکھا دوسروں کو سکھایا

بہ کمثل جراب محشو مسکاً یفوح — اور اس پر عمل کیا اس کی مثال اس تھیلی

کل مکان و مثل من تعلمہ فرقد — کی سی ہے جس میں مشک بھرا ہوا ہے

وھو فی جوفہ کمثل جراب اوکئ — اور ہر طرف اسکی خوشبو اڑ رہی ہو اور جس

علی مسک — نے اس کو سیکھا اور غافل ہو گیا، اسکی مثال اس

(ابن ماجہ) — تھیلی کی سی ہے جسمیں مشک بھرا ہے لیکن اسکا منھ بند کر دیا گیا ہو

عن ابی ذر قال قال رسول اللہ — ابوذر روایت کرتے ہیں فرمایا رسول اللہ

صلعم یا اباذر لان تغدو فتعلم — صلعم نے اے ابوذر تم اس حالت میں

آیات من کتاب اللہ خیر لک — صبح کرو کہ قرآن کی ایک آیت سیکھو

من ان تصل مائۃ رکعۃ (ابن ماجہ) — سو رکعت نماز پڑھنے سے بہتر ہے،

الماھر بالقرآن مع السفرۃ الکرام — قرآن کا ماہر (قیامت میں) بزرگ اور

البررۃ ، (ترمذی) — نیکوکاروں کے ساتھ ہوگا،

تعلموا الفرائض والقرآن وعلموا — فرائض اور قرآن کو سیکھو اور اسکو دوسروں

الناس فانی مقبوض ، (رر) — کو سکھاؤ کہ میں وفات پانے والا ہوں،

اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ تعلیم قرآن کا تعلق آپ کی ذات گرامی سے تھا،

قرآن کی تعلیم وتعلم کی ترغیب کی یہ صرف چند حدیثیں نقل کی گئیں ورنہ کتبِ حدیث میں ان کی بڑی تعداد ہے،

تعلیم قرآن کا انتظام اس ترغیب کے ساتھ آپ نے تعلیم قرآن کا خاص اہتمام فرمایا تھا، یوں تو آپ کی ذات گرامی قرآن کی زندہ درسگاہ تھی، آپ اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے ہر وقت تعلیم دیتے تھے، لیکن اس کے علاوہ تعلیم قرآن کے لئے صفہ کی درسگاہ تھی، اس میں صحابۂ کرام قرآن کی تعلیم حاصل کرتے تھے،

"اس میں دو حلقے تھے، ایک اصحاب ذکر وفکر کا دوسرا قراء کا، آپ جب تشریف لاتے تو بحیثیت معلم قرآن کے قراء کے حلقہ میں بیٹھتے اور فرماتے میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں"،

(سنن ابن ماجہ ~~ابوداؤد~~ فضل العلماء والحث علی طلب العلم)

اصحابِ صفہ کو تعلیم دینے کے ساتھ ان کو ترغیب بھی دلاتے تھے،

"ابن عامر کا بیان ہے کہ ایک دن آنحضرت صلعم تشریف لائے، ہم لوگ صفہ میں تھے، آپ نے فرمایا تم میں سے کون یہ پسند کرتا ہے کہ وہ ہر روز بطحان اور عقیق جاکر بغیر کسی گناہ اور قطع رحم کے موٹے کوہان والی دو اونٹنیاں حاصل کرے، ہم لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم سب چاہتے ہیں، فرمایا تو تم میں سے کوئی صبح کو کیوں مسجد نہیں جاتا کہ وہاں قرآن کی تعلیم حاصل کرے، اور قرآن کی دو آیتیں پڑھے جو اس کے لئے دو اونٹنیوں سے اور تین آیتیں تین اونٹنیوں سے اور چار آیتیں چار اونٹنیوں سے اسی طریقہ سے اس سے زیادہ آیتیں اس سے زیادہ اونٹنیوں سے بہتر ہیں، (مسلم)

اس درسگاہ میں آنحضرت صلعم کے علاوہ قراء صحابہ بھی تعلیم دیتے تھے، حضرت عبادہ بن صامت جو حفاظ قرآن صحابہ میں نہایت ممتاز تھے، اس درسگاہ کے معلم تھے، آپ کا بیان ہے

علمت ناسًا من اہل الصفۃ القرآن والکتاب[1] الخ — ہم نے چند اہلِ صفہ کو قرآن اور کتابت کی تعلیم دی تھی،

جن لوگوں کو کاروبار کی مشغولیت کی وجہ سے دن کو تعلیم کا موقع نہ ملتا تھا وہ رات کو حاصل کرتے تھے،

وکانوا اذا جنہم اللیل انطلقوا الی معلم لہم بالمدینۃ فیدرسون اللیل حتی اصبحوا، (مسند احمد بن حنبل ج ۵ ص ۳۲۴) — جب رات ہو جاتی تھی تو یہ لوگ (اصحاب صفہ) مدینہ کے ایک معلم کے پاس جاتے تھے اور صبح تک پڑھنے میں مشغول رہتے تھے،

جدید الاسلام اشخاص اور قبائل کی تعلیم کا انتظام مکی اور مدنی مسلمانوں کو تو ہر وقت مہبطِ وحی والہام کی صحبت حاصل تھی، ان کے لئے ہر طرح کی سہولتیں تھیں، لیکن ان جدید الاسلام اشخاص اور قبائل کو جو مرکز قرآن سے دور رہتے تھے اور ان کو مدینہ آنے کا صرف ایک دو مرتبہ اتفاق ہوتا تھا، اس کا موقع بھی میسر نہ آتا تھا، اس لئے ان کی تعلیم کا خاص انتظام کیا گیا تھا، جو لوگ مدینہ آتے تھے انھیں آنحضرت صلعم عموماً انصار کے سپرد کر دیتے تھے جو انکی میزبانی کے ساتھ انھیں قرآن کی تعلیم بھی دیتے تھے، وفد عبد القیس کا بیان ہے،

ان الانصار یعلمونا کتاب ربنا وسنۃ نبینا — انصار ہم کو ہمارے رب کی کتاب اور ہمارے نبی کی سنت کی تعلیم دیتے تھے،

وفد بنی تمیم نے کچھ دنوں مدینہ میں قیام کر کے قرآن کی تعلیم حاصل کی[2]،

اسی طریقہ سے جدید الاسلام قبائل کے جو وفود مدینہ آتے تھے، ان میں سے بیشتر کچھ

---

[1] مسند احمد بن حنبل ج ۵ ص ۳۲۴ [2] اسد الغابہ ج ۴ ص ۸۸،

دنوں یہاں ٹھہر کر بقدر ضرورت قرآن کی تعلیم حاصل کرتے تھے، ان کے حالات حدیث اور سیرت کی کتابوں میں مذکور ہیں،

جو قبائل یا اشخاص کسی معذوری کی بنا پر مدینہ نہیں پہنچ سکتے تھے، یا تعلیم کی مدت کے بقدر یہاں قیام نہیں کر سکتے تھے، ان کی تعلیم کے لئے کبھی مستقل معلمین بھیجے جاتے تھے اور کبھی یہ خدمت ان عمال اور قضاۃ کے سپرد کیجاتی تھی جو ان فرائض کے ساتھ تعلیم کی خدمت بھی انجام دیتے تھے، جن میں عموماً علمائے صحابہ ہوتے تھے، چنانچہ انصار کی پہلی بیعت کے بعد جب مدینہ کے کچھ گھرانوں میں اسلام پھیلا تو ان کی تعلیم قرآن کے لئے حضرت مصعب بن عمیرؓ اور ابن مکتومؓ بھیجے گئے[۱]، آنحضرت صلعم نے جب حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن کا قاضی مقرر کرکے بھیجا تو قرآن اور شرائع اسلام کی تعلیم بھی ان کے سپرد کی[۲]، اسی طریقہ سے مختلف مقامات اور قبائل میں حفاظ صحابہ بھیجے جاتے تھے،

تعلیم قرآن کی نوعیت صحابہ کی تعلیم قرآن کی صرف یہ نوعیت نہ تھی کہ آنحضرت صلعم سے محض چند سورتیں سیکھ لیں، یا پورا قرآن ناظرہ کر لیا یا قرأت کی تصحیح کر لی، بلکہ بقدر ذوق و استعداد پوری محنت اور جانفشانی سے ابتدائی تعلیم سے لے کر انتہائی تعلیم تک حاصل کرتے تھے،

حضرت ابی بن کعبؓ نے پورا قرآن آنحضرت صلعم کی زبان مبارک سے سن کر یاد کیا تھا[۳]، حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے آپ سے ستر سورتیں سیکھی تھیں، (بخاری ج ۲ ص ۷۴۸)

اور اس مشقت اور جامعیت کیساتھ کہ ان دونوں کا خود بیان ہے کہ "رسول اللہ صلعم جب ہم کو قرآن کی دس آیتیں پڑھاتے تھے تو جب تک ہم ان پر عمل نہ سیکھ لیتے تھے اس وقت تک اگلی دس آیتوں کی طرف نہ بڑھتے تھے، اس طریقہ سے ہم نے قرآن اور اس پر عمل دونوں

[۱] بخاری کتاب التفسیر [۲] استیعاب تذکرہ معاذ بن جبل [۳] مسند احمد بن حنبل، ج ۵ صفحہ ۱۱۳

کو ساتھ سیکھا[۱]،

یہی طریقہ عام تعلیم کا تھا، ترجمان القرآن حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کا بیان ہے،

منا اذا تعلم عشر آیات لم	جب ہم میں سے کوئی شخص دس آیتیں سیکھ
یجاوزھن حتی یعرف معنیھن	لیتا تھا تو اس وقت تک ان سے آگے
والعمل بھن (ابن جریر ج ۱ ص ۲۶)	نہ بڑھتا تھا جب تک انکے معنی اور ان پر عمل نہ سیکھ لیتا

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے سورۂ بقرہ کی تعلیم پر کامل آٹھ سال صرف کئے[۲]،

اس محنت کا نتیجہ یہ تھا کہ قرآن کے متعلقات میں سے کوئی شے مفسر قرآن صحابہ کی نظر سے پوشیدہ نہ رہی تھی، پھر بھی ان کے ذوق و جستجو کو تسکین نہ ہوتی تھی ترجمان القرآن حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے[۳]،

والذی لا الٰہ غیرہ ما نزلت	اس ذات کی قسم جسکے سوا دوسرا معبود نہیں،
آیۃ فی کتاب اللہ الا وانا	کتاب اللہ میں کوئی ایسی آیت نازل
اعلم فیم نزلت واین نزلت	نہیں ہوئی جس کے متعلق میں یہ نہ جانتا
ولو اعلم مکان احد اعلم	ہوں کہ وہ کس کے بارہ میں نازل ہوئی
بکتاب اللہ منی تنالہ المطایا	اور کہاں نازل ہوئی (اسکے باوجود)
لاتیتہ،	اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ مجھ سے زیادہ قرآن کا کوئی جاننے والا موجود ہے اور وہاں تک میری پہنچ ہو سکے تو میں ضرور (ابن جریر ج ۱ ص ۲۷)

[۱] ابن جریر و تفسیر قرطبی ج اول ص ۲۴ [۲] ایضاً بحوالہ موطا امام مالک، [۳] ابن جریر ج اول ص ۲۷،

تمام اکابر حفاظ قرآن صحابہ نے اسی ذوق وجستجو، اسی محنت وجانفشانی اور اسی جامعیت کے ساتھ قرآن کی تعلیم حاصل کی تھی، حضرت ابی بن کعب، معاذ بن جبل، عبادہ بن صامت، ابو ایوب انصاری، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عمرو بن العاص وغیرہ قرار صحابہ کی تعلیم قرآن کے حدیث کی کتابوں میں سیکڑوں واقعات ہیں جنھیں نقل کرنے کے لئے مستقل کتاب چاہئے اس لئے انھیں ہم قلم انداز کرتے ہیں،

تابعین کے زمانہ میں بھی تعلیم قرآن کا یہی انداز تھا، ابو عبدالرحمن اسلمی تابعی کا بیان ہے،

جب ہم قرآن کی دس آیتیں سیکھ لیتے تھے تو اس وقت تک آگے نہ بڑھتے تھے جب تک اس کے حلال وحرام اور امر ونہی سے واقف نہ ہو جاتے تھے (تفسیر قرطبی ج اول ص ۳۴ بحوالہ ابن ابی شیبہ)

مشہور تابعی مفسر مجاہد بن جبیر نے ترجمان القرآن حضرت ابن عباس سے کامل تیس مرتبہ قرآن کا دورہ کیا تھا[1]، اور اس تحقیق کے ساتھ کہ ہر سورہ کے شان نزول اور اس کے جملہ متعلقات کی تحقیق کرتے جاتے تھے[2]،

خلفائے راشدین کا تعلیم قرآن میں اہتمام

آنحضرت صلعم کے بعد چاروں خلفاء نے بھی قرآن کی تعلیم اور اسکی اشاعت کو اپنا مقدم فرض تصور کیا، حضرت عمرؓ نے خصوصیت کے ساتھ تعلیم قرآن کی بڑی اشاعت کی، تمام ممالک مفتوحہ میں قرآن کے مکاتب قائم کئے اور ان مین تعلیم کے لئے قرار صحابہ کو بھیجا،

چنانچہ حضرت عبادہ بن صامت، معاذ بن جبل اور ابو درداء رضی اللہ عنہم کو شام بھیجا، حضرت عبادہؓ نے حمص میں قیام کیا، ابو درداءؓ نے دمشق کو مستقر بنایا اور معاذ بن جبل نے فلسطین مین

۱ ابن سعد ج ۵ ص ۳۴۴ ۲ تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۴،

اقامت اختیار کی، پھر عبادہؓ بھی یہیں چلے آئے[1]، عمران بن حصین کو قرآن اور فقہ کی تعلیم کے لئے بصرہ بھیجا[2]، ایک قاری ابو سفیانؓ کو خاص بدوؤں کی تعلیم کے لئے مقرر کیا کہ وہ قبائل کا دورہ کرکے ہر شخص کا امتحان لیں، اور جس کو قرآن یاد نہ ہو اس کو سزا دیں[3]، جن سورتوں میں احکام وفرائض بیان کئے گئے ہیں، مثلاً سورۂ بقرہ، مائدہ، حج، اور نور کا سیکھنا ہر مسلمان کیلئے ضروری قرار دیا[4]، حفاظ قرآن کے وظائف مقرر کئے[5]،

خود آپ کی مجلسوں میں تفسیر قرآن پر بحث وگفتگو ہوتی تھی جس میں اکابر صحابہ اظہار خیال کرتے تھے، حضرت ابن عباسؓ اگرچہ کمسن تھے لیکن انکے ذوق اور علم کی وجہ سے انھیں آپ اس مجلس میں شریک کرتے تھے، بعض صحابہ کو اس پر اعتراض ہوا کہ ابن عباس کے برابر ان کے لڑکے ہیں ان کو اس مجلس میں کیوں شریک کیا جاتا ہے، اس اعتراض پر آپ نے حاضرین کو ابن عباس کے فہم قرآن کا مشاہدہ کرانے کے لئے حاضرین سے إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ کا مقصد پوچھا، لوگوں نے مختلف جوابات دیئے، آخر میں آپؓ نے ابن عباس سے پوچھا، انھوں نے کہا اس میں آنحضرت صلعم کی وفات کا اشارہ ہے، حضرت عمرؓ نے فرمایا میرا بھی یہی خیال ہے[6]،

حضرت عمرؓ نے قرآن کی تعلیم کی اشاعت کا جس پیمانہ پر انتظام کیا اس کی تفصیلات بہت ہیں، حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ بھی اپنے اپنے زمانہ میں اس فرض کو انجام دیتے رہے، لیکن تعلیم قرآن کی تاریخ لکھنا ہمارا مقصود نہیں اس لئے انھیں قلم انداز کرتے ہیں،

بلکہ صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ فہم قرآن اور اس کی تفسیر وتاویل کے لئے محض عربی زبان کا جاننا کافی نہیں ہے، کہ عربی تو ہر بدوی کی مادری زبان تھی، متعدد صحابہ نوشت وخواند

۱ اسد الغابہ تذکرہ عبادہ بن صامت ۲ فتوح البلدان بلاذری ص ۲۵۸ ۳ اصابہ تذکرہ اوس بن خالد ۴ کنز العمال ج اول ص ۲۲۴ ۵ ایضاً ۶ بخاری کتاب التفسیر باب قولہ فسبح بحمد ربک،

بلکہ دوسرے مذاہب کا بھی علم رکھتے تھے، اگر تنہا عربی زبان کا جاننا کافی ہوتا تو تعلیم قرآن کیلئے اتنے اہتمام و انتظام کی ضرورت نہ تھی، لیکن رسول اللہ صلعم جس طرح سلمانؓ فارسی، اور بلالؓ حبشی کو قرآن کی تعلیم دیتے تھے، اس طرح علیؓ ہاشمی و مطلبی کو بھی، جس طرح دیہات کے جاہل بدوٗں کو قرآن کی آیات سمجھاتے تھے اسی طرح ابو بکرؓ صدیق اور عمرؓ فاروق کو بھی گو اس کی نوعیت مختلف ہوتی تھی، اکابر صحابہ کی تعلیم قرآن کے حالات حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں،

یہ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ کسی زبان کے معمولی معنی سمجھ لینے اور اس کی بلند پایہ علمی اور فنی کتابوں کے سمجھنے کے لئے مختلف استعدادوں کی ضرورت ہے، اردو زبان کی معمولی کتابیں تو ہر معمولی پڑھا لکھا سمجھ سکتا ہے، لیکن علمی کتابوں کے دقیق مباحث سمجھنے کے لئے تنہا اردو سمجھ لینا کافی نہیں ہے بلکہ اس کے لئے اور بہت سے علوم اور خاص استعداد و قابلیت کی ضرورت ہے، علمی مباحث کو جانے دیجئے، وہ اردو شاعری کے نکات و لطائف نہیں سمجھ سکتا، ایسی حالت میں قرآن کی تعلیمات اس کے اوامر و نواہی اور اسکے اسرار و حکم تنہا عربی زبان کی مدد سے کس طرح سمجھے جا سکتے ہیں،

قرآن کا ترجمان رسولؐ ہے دنیا کے تمام علوم و فنون کے خاص اصول و قواعد ہوتے ہیں اور انکی ایک روح ہوتی ہے جسے ہم موجودہ اصطلاح میں ان فنون کی سائنس کہہ سکتے ہیں جبتک اس روح اور اس سائنس سے واقفیت نہ ہوگی اس وقت تک ان علوم کو نہیں سمجھا جا سکتا، یہی حال کلام اللہ کا ہے، اسکی روح کا سب سے بڑا عارف رسولؐ ہے، کہ وہی اس کلام کا مخاطب اول و مبلغ تھا اور اسی کے ذریعہ سے قرآن کو دنیا کی رہنمائی کے لئے بھیجا گیا تھا، اس لئے وہی اس کا سب سے بہتر ترجمان بھی ہو سکتا ہے، قرآن بھی اس کا شاہد ہے، رسولؐ پر نزول قرآن کی مصلحت کے بارہ میں خدا فرماتا ہے،

وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ، (نحل - ۶)

اور ہم نے تمہاری طرف اس لئے نصیحت (قرآن) اتاری ہے کہ تم اس چیز کو جو لوگوں کے لئے اتاری گئی ان سے کھول کر بیان کردو کہ وہ اسے سوچیں،

اس آیت پاک میں رسولؐ کا فرض "قرآن" کی "تبیین" بتایا گیا ہے، "تبیین" کے معنی لغت میں ظاہر کرنے، واضح کرنے اور تشریح و توضیح کے ہیں، قرآن میں یہ لفظ تین معنوں میں استعمال ہوا ہے،

(۱) کسی چیز کو واضح اور شرح کرنے کے معنی میں،

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيَاتِهٖ لِلنَّاسِ، (بقرہ - ۲۳)

اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنی آیات (احکام) کو کھول کر بیان کرتا ہے،

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ اٰيَاتِهٖ (بقرہ - ۳۱)

اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اپنی آیات (احکام) کو کھول کر بیان کرتا ہے،

(۲) پوشیدہ چیزوں کو ظاہر کرنے کے معنی میں،

يٰاَهْلَ الْكِتٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيْرًا مِّمَّا كُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْكِتٰبِ (مائدہ ۳)

اے اہل کتاب ہمارا رسول تمہارے پاس آچکا ہے اور کتاب (توریت) میں سے تم جو کچھ چھپاتے ہو اسکو وہ ظاہر کرتا ہے،

اس آیت کا تعلق اہل کتاب سے ظاہر ہے، اس "تبیین" سے مراد توریت کے ان احکام کا اظہار ہے جنھیں یہود اپنی خود غرضی سے چھپاتے تھے، اور قرآن نے ان کو ظاہر کیا،

(۳) ان مختلف فیہ امور میں اظہار حق کے لئے جن میں کفار محض اپنی جہالت اور گمراہی سے

اختلاف کرتے ہیں،

وَلَيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ، (نحل - ۱۳)

اور جن چیزوں میں تم لوگ اختلاف کرتے ہو قیامت کے دن خدا ضرور تم پر اس کی حقیقت ظاہر کر دے گا،

لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي يَخْتَلِفُونَ فِيهِ وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّهُمْ كَانُوا كَاذِبِينَ، (نحل - ۵)

جن چیزوں میں یہ لوگ اختلاف کرتے ہیں ان کی حقیقت ضرور ظاہر کر دی جائیگی تاکہ کافروں کو معلوم ہو جائے کہ وہ جھوٹے ہیں

اس اظہار اور "تبیین" کا تعلق قیامت سے ہے، یعنی کفار دنیا میں اپنی جہالت اور گمراہی سے جن چیزون میں اختلاف کرتے ہیں خدا قیامت میں اس کی حقیقت ظاہر کر دے گا، ان تینون معنی کے معلوم ہو جانے کے بعد "تبیین للناس" میں تبیین کے معنی خود بخود متعین ہو جاتے ہیں کہ اس کا تعلق نہ اہل کتاب کے "کتمان حق" کے اظہار سے ہے اور نہ مختلف فیہ امور میں اظہار حقیقت کے لئے، اس لئے صرف تیسرے معنی یعنی قرآن کی تشریح و وضاحت مراد ہے اور یہی سنت ہے، رسول کی یہ تشریح و توضیح بھی اگرچہ وحی کی شکل میں نہ تھی لیکن درحقیقت یہ بھی منجانب اللہ تھی، اس لئے خدا نے قرآن میں فرمایا ہے کہ قرآن کا سمجھانا ہمارے ذمہ ہے، نزولِ وحی کے وقت رسول اللہ صلعم اس کو محفوظ کرنے کے لئے جلدی جلدی پڑھتے تھے اس پر یہ آیتین نازل ہوئیں،

لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ، إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ، فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ، ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ، (قیامت)

قرآن کے ساتھ اپنی زبان کو اس لئے حرکت نہ دو کہ اسکو جلدی سے یاد کر لو، تمہارے سینہ میں اس کا جمع کرانا اور اس کا پڑھوا دینا ہمارا ذمہ ہے، جب ہم پڑھ چکیں (بذریعہ وحی) تو

قرآن کی عبارت کو محفوظ کرانے کے بعد اس کے سمجھانے کے معنی صرف اس کے احکام و تعلیمات کے سمجھانے ہی کے ہو سکتے ہیں، حضرت ابن عباسؓ وغیرہ مفسر صحابہ کا بھی یہی خیال ہے، اس سے معلوم ہوا کہ رسول کی تشریح و توضیح بھی منجانب اللہ تھی،

بعض حدیثون سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، حضرت عائشہؓ فرماتی ہین،

ماكان النبي صلعم يفسر شيئًا من القرآن إلا آيًا تعدّ علمهن إياه جبريل، (ابن جریر ج ۱ ص ۲۸)

رسول اللہ صلعم انھی گنی ہوئی آیات کی تفسیر فرماتے تھے جنھین آپ کو جبریل سکھاتے تھے،

رسولؐ کے بعد صحابہ ترجمان تھے

یہ ایک بالکل فطری اور علمی اصول ہے کہ رسول اللہ صلعم کے بعد قرآن کی ترجمان وہی جماعت ہو سکتی ہے جو نزولِ قرآن کے وقت مکتب نبوی مین موجود تھی، جس کے سامنے نزولِ قرآن کی پوری تاریخ تھی، جس کی زبان عربی تھی، جو عرب کے عقائد، رسوم اور معاشرت سے واقف تھی، جس کی نگاہون کے سامنے قرآن نے اس کی اصلاح کی، جس نے سالہا سال تک خود رسول سے قرآن کی ایک ایک آیت اور ایک ایک لفظ کو سمجھا، رسول اللہ نے بڑے اہتمام سے اس کی تعلیم و تربیت کی، اور قرآنی تعلیمات کو عملاً برت کر اسے سمجھایا اور اسکو ان کا پابند بنایا، پھر اسی اہتمام سے صحابہ نے تابعین کو اور تابعین نے تبع تابعین کو یہ امانت پہنچائی،

صحابہ کی قرآن کی ترجمانی کسی مذہبی عقیدہ کی بنا پر نہین بلکہ خالص علمی اصول پر ماننا پڑیگی، فرض کیجئے آج سے چند سو برس پہلے ایک قانون بنتا ہے، کئی صدیون کے بعد اس کی کسی دفعہ کے مفہوم و منشا کے سمجھنے میں اختلاف ہوتا ہے تو خالص علمی اصول پر اس کی شارح کون جماعت مانی جائے گی، وہ جماعت مانی جائے گی جس کے سامنے یہ قانون بنا جو اس کے

ماحول اور اس کے اسباب سے واقف تھی، خود اس قانون کے شارحِ اول کی زبان سے اسکی ایک ایک دفعہ کے مفہوم اور منشا کو سمجھا، اس نے خاص اہتمام سے سمجھایا، اور عملاً نافذ کرکے اور برت کر دکھایا اور اسی طریقہ سے علی التواتر صدیوں تک اس پر عمل ہوتا رہا، یا صدیوں بعد کی وہ نوپید جماعت، جس کو نہ اس قانون کی تاریخ سے ذاتی واقفیت ہے نہ حالات سے، نہ اس کے ماحول سے، نہ مادری زبان کی حیثیت سے قانون کی زبان سے، اسکو جو کچھ بھی علم ہے وہ اسی پہلی جماعت کے وسیلہ سے، ظاہر ہے کہ پہلی جماعت اس قانون کی بہتر ترجمان اور شارح سمجھی جائے گی اور اس کی تاویل و تشریح میں اسی کا قول سند مانا جائے گا، اس اصول کے لحاظ سے کلام پاک کے سب سے بہتر اور مستند ترجمان اور شارح صحابۂ کرام ہین اور ان کے بعد ان کی وہ روایات جو انتہائی بشری احتیاط کے ساتھ اب تک محفوظ چلی آتی ہیں،

اصول شہادت کی رو سے روایات صحابہ کا پایہ

اس موقع پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ صحابۂ کرام کی تفسیرین صحیح، لیکن ہمارے پاس اس کا کیا ثبوت ہے کہ موجودہ تفسیری روایات صحابہ کرام ہی کی ہیں اور ان مین کسی قسم کا تغیر و تبدل نہین ہوا،

اس کو بھی خالص علمی اصول اور اصولِ شہادت کی رو سے جانچنا چاہئے، اس عالم محسوس، اور مادی دنیا میں کسی چیز کے علم یقین کے صرف دو ہی ذرائع ہین، عینی مشاہدہ جس مین آنکھ سے دیکھنے کے ساتھ کان سے سننا بھی شامل ہے اور مستند شہادت، پہلی صورت اپنے زمانہ کے واقعات کے ساتھ مخصوص ہے، اپنے سے قبل کے واقعات کے علم یقین کی صرف ایک صورت ہے، مستند شہادت، اس شہادت کے بھی دو پہلو ہین، ایک ان کی صداقت واستناد کا درجہ، دوسرے ان کی کثرت و تواتر، ان ہی دونون چیزون پر تمام گذشتہ قومون

اور ملکون کی تاریخ کے علم کا دارومدار ہے، اگر اسے نہ مانا جائے تو پھر ساری دنیا کی تاریخ افسانہ بن جائے گی، ہمارے پاس اس کا ثبوت کیا رہ جائیگا کہ یونان، روما اور مصر وغیرہ کوئی تاریخ بھی رکھتے تھے، پرانی تاریخون کو جانے دیجئے، اپنے زمانہ کو لیجئے، اس مین بھی بہت سے امور مین ہمارے علم یقین کا دارومدار صرف شہادت پر ہے، جو شخص یورپ نہیں گیا ہے، اس کے پاس جرمنی، فرانس اور روس کے وجود کے یقین کا شہادت کے علاوہ اور کیا ذریعہ ہے، یہی نہ کہ ہم بچپن سے ان کے حالات سنتے آئے ہیں، کتابوں میں پڑھتے ہیں، اخبارات میں دیکھتے ہین، آنے جانے والوں سے سنتے ہین لیکن ان میں سے ہر ایک ذریعہ صرف شہادت ہے، عینی مشاہدہ نہیں، اس کے باوجود ہم کو ان کے وجود کا اتنا ہی یقین ہے جتنا اپنی ذات کا، یہ کیا ہے صرف شہادت کا درجۂ استناد اور اس کا تواتر،

ایک اور مثال لیجئے، دنیا کا سارا نظامِ عدالت اسی شہادت پر ہے، ایک حاکم عدالت کی کرسی پر بیٹھتا ہے، اس کے سامنے سیکڑون قسم کے مقدمات پیش ہوتے ہین جن کے متعلق اس کو کوئی ذاتی علم اور عینی مشاہدہ نہیں ہے لیکن وہ صرف شہادت کے درجہ استناد اور اس کے تواتر سے علم یقین حاصل کرکے فیصلہ کر دیتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ دنیا کا سارا نظام شہادت پر قائم ہے، اس کے بغیر تو ہم ایک قدم بھی نہیں چل سکتے،

البتہ علم یقین کے لئے شہادت کا درجۂ استناد اور اس کا تواتر ضروری ہے، اسکو بھی اسی علمی اصول سے جانچئے، اس لحاظ سے روایتِ حدیث کے مقابلہ میں دنیا کی کونسی شہادت پیش کیجا سکتی ہے، اس موقع پر ہم رجال اور اصولِ حدیث کی تفصیلات میں پڑنا نہیں چاہتا کہ یہ بحث بہت لمبی ہے اور اس مضمون کے مخاطب وہ لوگ ہیں جو اس سے واقف ہین، اس لئے سوال ہے کہ حدیث کی صحت اور روایت کے اصولِ شہادت کے مقابلہ مین وہ دنیا کی

کونسی شہادت اور کس تاریخی سرمایہ کو پیش کر سکتے ہیں؟ اگر اسکا جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہے تو جس اصول کو ساری دنیا کی تاریخ کے علم یقین کیلئے مانا جاتا ہے اسے روایتِ حدیث میں کس طرح غلط یا ناقابل یقین ٹھہرایا جاسکتا ہے؟ اگر ہم روایاتِ صحابہ کو ناقابل اعتبار سمجھتے ہیں، تو ہمارے پاس خود اسلام کی تاریخ کا کیا ثبوت اور کیا ذریعہ رہجاتا ہے؟ کلام اللہ عہدِ رسالت کی تاریخ کی حیثیت سے بالکل ناکافی ہے، اس میں خاص خاص اہم واقعات کے صرف اشارات ہیں یا زیادہ سے زیادہ مجمل بیانات ہیں، پھر یہ اسلام کی ابتدائی تاریخ کہاں سے مرتب ہوئی ہے؟ عرب جاہلی کے عقائد کیا تھے، رسوم کیا تھے، معاشرت کیا تھی، اسلام نے اس میں کیا اصلاح کی، رسول اللہ صلعم کو تبلیغ اسلام میں کیا کیا واقعات پیش آئے، دعوتِ اسلام، اس راہ کے شدائد، مشرکین کی مخالفت، ہجرت، مدنی زندگی، غزوات، مشرکین، منافقین اور یہود و نصاریٰ کا طرزِ عمل، انصار، مہاجرین اور اکابر صحابہ کی قربانیاں، غرض نبوت کی پوری ۲۳ سالہ تاریخ کس چیز سے مرتب ہوئی ہے، حدیث سے اور صرف حدیث سے، اور اس پر ایسا ہی یقین ہے جیسے اپنے زمانہ کے عینی مشاہدات پر، پھر اسلام کی تاریخ مین تو حدیث کو علم یقین کا درجہ دیا جائے اور قرآن کی تفسیر میں اس کو ناقابل اعتماد ٹھہرایا جائے، آخر کس اصول پر؟ صرف من مانی تاویلات کے لئے؟ حدیثیں طبری اور ابن اثیر سے بھی گئی گذری ہوئیں، کہ ان سے تو ثبوت لایا جائے، ان کے بیانات کو تو یقین کا درجہ دیا جائے، لیکن حدیث کو یہ درجہ بھی حاصل نہیں، اس تفصیل سے یہ واضح ہوگیا کہ خالص علمی اور فطری اصول سے بھی ہم احادیث کو نظر انداز نہیں کر سکتے بلکہ ان کی صداقت کے اعتراف پر مجبور ہیں اور اسلام کی تاریخ مین بغیر اس کے چارہ کار ہی نہیں ہے، (باقی)

مولانا کاتبی نیشاپوری

از

مولٰنا عبد السلام ندوی

مولٰنا شبلی مرحوم کی کتاب "شعر العجم" اگرچہ فارسی شاعری کی نہایت مفصل تاریخ ہے تاہم ابھی اس پر اضافہ کرنیکی بہت کچھ گنجایش ہے، مولٰنا مرحوم نے اس کتاب مین ایک خاص تاریخی دَور کو جو آٹھوین صدی سے شروع ہوا، اور نوین صدی تک قائم رہا، کسی مصلحت سے نظرانداز کر دیا ہے، حالانکہ اس دور مین بھی بہت سے باکمال شعرا پیدا ہوئے، اور انھون نے ایک خاص طرز ایجاد کی، اس لئے ضرورت تھی کہ اس دور کی ادبی اور تاریخی خصوصیات کو بھی نمایان کیا جائے، سید وزارت علی صاحب (گڑگانوان پنجاب) کی یہ خدمت لائقِ ستایش ہے، کہ انھون نے اس دور کے سب سے زیادہ ممتاز شاعر مولٰنا کاتبی کے کلام کا ایک عمدہ مجموعۂ انتخاب مرتب کیا، اور ہمارے رفیق مولینا عبد السلام ندوی نے اس پر ایک مقدمہ لکھکر مولٰنا کاتبی کے حالات کے ساتھ نہ صرف ان کی شاعری پر ایک مفصل تبصرہ لکھا، بلکہ اس دور کی شاعرانہ خصوصیات کو بھی نمایان کیا، ہم ناظرین معارف کی دلچسپی کے لئے اس مقدمہ کو معارف مین شائع کرتے ہین، اور ہم کو امید ہے کہ جب اس مقدمہ کے ساتھ یہ مجموعۂ انتخاب شائع ہوگا، تو فارسی شاعری کے قدر دانون مین اس مقدمہ سے اس مجموعۂ انتخاب کی، اور اس مجموعۂ انتخاب سے اس مقدمہ کی وقعت اور اہمیت بہت زیادہ بڑھ جائیگی،

فرمانروایانِ اسلام کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کے دورِ حکومت نے بہ کثرت ایسے جلیل القدر افراد پیدا کئے ہیں، جن پر اسلام کی علمی تاریخ ہمیشہ ناز کر سکتی ہے، یہی وجہ ہے کہ ان فرمانرواؤں کے تذکرہ میں ان جلیل القدر افراد کا تذکرہ بھی کیا جاتا ہے، اور ان کے وجود کو ان کے دورِ حکومت کے حسنات و برکات میں شمار کیا جاتا ہے، چنانچہ نوین صدی کے فرمانروایانِ اسلام میں سلطان شاہ رُخ بہادر اسی قسم کا ایک نامور فرمانروا گذرا ہے، جو ۱۴ ربیع الاول ۷۷۹ھ میں پیدا ہوا، اور سلطان صاحب قران امیر تیمور گورگان کے بعد ۴۳ سال بلکہ ۵۰ سال تک ایران، توران اور ہندوستان پر حکومت کرکے ذیحجہ ۸۵۰ھ میں وفات پائی، دولت شاہ سمرقندی نے عارف کامل نورالدین نعمت اللہ کوہستانی کے تذکرہ میں، اس نامور بادشاہ کا جو ضمنی تذکرہ کیا ہے، اسکی ابتدا ان الفاظ سے کی ہے،

"اما خاقان سعید ظل اللہ فی الخافقین شاہ رخ بہادر گورگان انار اللہ برہانہ بادشاہے بود موفق بتوفیق یزدانی و موید بتائید صمدانی بختے مساعد و دولت موافق داشت و عدلے بر دوام و شفقتے تمام دربارۂ عوام و خواص داشتے رعایا آن آسودگی و فراغت کہ بروزگار دولت او یافتہ اند، از عہد آدم الی یومنا درہیچ عہد و زمان و دور و اوان نشان نداوہ اند بسیرت پسندیدہ و متابعت شریعت گوے مراد از میدان سلاطین در ربود"[۱]

ان سیاسی اخلاقی اور مذہبی فضائل کے ساتھ اس کا دورِ حکومت علمی حیثیت سے بھی خاص امتیاز رکھتا تھا، اور اوس کے زمانہ میں اسلام کے متعدد ایسے مایۂ ناز فرزند پیدا ہوئے، جن پر مسلمانوں کی علمی تاریخ آج تک ناز کرتی ہے، دولت شاہ نے اس کے ضمنی تذکرے میں ان نامورانِ اسلام کا نام بھی لیا ہے، اور اس انداز سے لیا ہے، گویا ان کا وجود اس کے دورِ حکومت کی ایک بہت بڑی برکت تھا، چنانچہ لکھتا ہے،

[۱] تذکرہ دولت شاہ سمرقندی از ص ۳۳۷ تا صفحہ ۳۳۰

اما از مشائخ و اکابر و علما و شعرا کہ بروزگار شاہ رُخ سلطان ظہور یافتہ اند سلطان العلما و المحققین شمس الملۃ والدین محمد الحافظی البخاری المعروف خواجہ پارسا قدس روحہا و خواجہ صاین الدین ترکہ اصفہانی و مولنا فاضل حسین خوارزمی و قدوۃ العلما و مفخر الفضلا مولینا شرف الدین علی یزدی و از شعرای بزرگ شیخ آذری و بابا سودائی و مولینا علی شہاب و امیر شاہی سبزواری و مولنا کاتبی ترشیزی، و مولانا نسیمی بودہ اند کہ ذکر تصانیف و دواوین این جماعت در ربع مسکون شہرت دارد، اما چہار ہنرمند در پاے تخت شاہ رخی بودہ اند کہ در ربعِ مسکون بروزگار خود نظیر نداشتہ اند، خواجہ عبدالقادر مراغی در علم ادوار و موسیقی و یوسف اندکانی در خوانندگی و مطربی و استاد قوام الدین در ہندسی و طراحی و معماری و مولینا خلیل مصور کہ ثانی مانی بودہ نوراللہ تعالیٰ مرقدہم،[۱]

دولت شاہ نے سلطان شاہ رُخ کے دورِ حکومت کے جن اربابِ کمال کا نام لیا ہے، ان کے فضائل و کمالات کے نمایاں کرنے میں اگر ہمارا موجودہ علمی اور تاریخی سرمایہ ہماری مددگری تو اسلام کی علمی اور ادبی تاریخ کے بہت سے ابواب و فصول کے روشن مناظر چشم بصیرت کے سامنے آسکتے ہین، لیکن سردست ان مین ہم صرف ایک باکمال شاعر کے سوانحِ حیات لکھنا چاہتے ہین، جس کا نام نامی محمد شمس الدین لقب[۲] اور کاتبی تخلص ہے، باپ کا نام عبداللہ تھا، طرق در آوش میں پیدا ہوا جو نیشاپور اور ترشیز کے درمیان ایک گاؤن کا نام ہے، لیکن نیشاپور اور ترشیز کی شہرت نے اوس کو اپنی طرف منسوب کرلیا، اور وہ کاتبی نیشاپوری اور کاتبی ترشیزی کے نام سے مشہور ہوگیا، اس انتساب کی ایک وجہ یہ بھی ہے، کہ مولینا کاتبی کی تعلیم و تربیت کا آغاز سب سے پہلے نیشاپور سے ہوا، اور ابتدا مین انھون نے نیشاپور مین آکر مولینا سیمی سے کتابت اور خوشخطی کی تعلیم حاصل کی، اور اس میں اس قدر کمال حاصل

[۱] تذکرہ دولت شاہ سمرقندی ص ۳۴۰ [۲] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ذکر کاتبی،

کی،[1] کہ کتب شاعری مین بھی ان کی یہ فنی حیثیت نمایان رہی، اور اسی وجہ سے انھون نے اپنا تخلص کاتبی اختیار کیا، آج کتابت اور خوشنویسی کا فن نہایت معمولی درجہ کا فن خیال کیا جاتا ہے، اور زیادہ تر یہ پیشہ وہ لوگ اختیار کرتے ہین، جو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی استعداد اور قابلیت نہین رکھتے، اس لئے اس زمانہ مین ایک خوشنویس گو کتنا ہی صاحب کمال ہو، سوسائٹی مین کوئی خاص وقعت اور شہرت نہین رکھتا، لیکن قدیم زمانہ مین اس فن نے متعدد وجوہ سے بہت زیادہ اہمیت حاصل کر لی تھی، ایک تو قرآن مجید کے خوشخط اور مطلاّ و مذہب نسخون کی بہت زیادہ قدر کیجاتی تھی، اس لئے جو لوگ اس فن مین کمال حاصل کر لیتے تھے، وہ قدرتی طور پر غیر معمولی شہرت حاصل کر لیتے تھے، یاقوت مستعصمی کا نام آج اوس زمانہ کے دوسرے صاحب کمالون سے کچھ کم روشن نہین ہے، لیکن اس کا طغرائے کمال قرآن مجید کی کتابت کے سوا اور کچھ نہین ہے، اس کے علاوہ اوس زمانہ مین چھاپہ خانہ کا رواج نہ تھا، اس لئے مشہور شعراء کے دواوین اور مشہور مصنفون کی تصنیفات عموماً ہاتھ سے لکھوائی جاتی تھین، اور اوس نے مشہور خوشنویسون کا درجہ بہت زیادہ بلند کر دیا تھا، چنانچہ مولینا جلال طبیب شیرازی نے ۷۳۴ھ مین ایک مثنوی "گل و نوروز" کے نام سے لکھی تھی، جو مبتدیون اور نوجوانون مین خاص طور پر مقبول تھی، مولینا نسیمی نیشاپوری (جو کاتبی کے استاد تھے،) نے ایک مہینہ مین اس مثنوی کے ۲۰ نسخے اپنے ہاتھ سے لکھے، اور یہ ایک نہایت تعجب انگیز واقعہ خیال کیا گیا،[2] یہی وجہ ہے کہ اوس زمانے کے تمام کتب خانون مین کاتبون کا ایک ممتاز گروہ ہمیشہ موجود رہتا تھا، مساجد، مقابر اور دوسری عمارتون کے

---

[1] وہ خود اس کمال پر اس طرح ناز کرتے ہین:-

رفتے کہ نشادی و نہ شیون باشد نے دست و قلم نہ جان و نے تن باشد،
بر خاطر دوستان دہد یاد مرا خطے کہ بیادگار از من باشد،

[2] دولت شاہ صفحہ ۲۰۹، ذکر مولانا جلال طبیب شیرازی،

جو کتبے لگائے جاتے تھے، اوس نے بھی مشہور خوشنویسون کی حیثیت کو بہت زیادہ نمایان کر دیا تھا، چنانچہ دولت شاہ شہزادہ ابراہیم کے ضمنی تذکرہ مین لکھتا ہے:-

"مشہور است کہ دفاتر فارس بخط مبارک خود نوشتہ بود، و در زیبائی خط بغایتے بود کہ نقل خط قبلۃ الکتاب یاقوت المستعصمی نمودے و فرستادے و فروختے و الیوم کتابہا کہ بر عمارات و مساجد و مدارس فارس نوشتہ باقیست و در جا و تعلیمہا کہ مزین کہ خط شریف اوست بین الکتاب الیوم موجود است"[1]

اس لئے اوس زمانہ مین خوشنویسی کی تعلیم نصاب تعلیم کا ایک ضروری جزو ہو گئی تھی، اور اس دور کے اکثر شرفا یہان تک کہ بادشاہون کے لڑکے تک اس فن کی تعلیم حاصل کرتے تھے، بالخصوص شہزادہ بایسنغر کے زمانہ مین جس کے دربار سے بعد کو مولانا کاتبی کا تعلق ہوا، فن کتابت کو اور بھی زیادہ ترقی ہوئی، اور خوشنویسون کا درجہ اور بھی زیادہ بلند ہوا، چنانچہ دولت شاہ شہزادہ بایسنغر کے ضمنی تذکرہ مین لکھتا ہے:-

"خط و شعر در روزگار او رواج یافت، گویند کہ چہل کاتب خوشنویس در کتابخانہ او بکتابت مشغول بودندے و مولانا جعفر تبریزی سرآمد کتاب بودہ"[2]۔

اس بنا پر زمانہ کے عام میلان کے مطابق مولانا کاتبی نے بھی اس فن لطیف کی طرف توجہ کی، اور مولنا نسیمی سے اسکی تعلیم حاصل کی جو اس فن مین خاص مہارت رکھتے تھے، اور یہی پیشہ کرتے تھے، ابتدا مین ان کا قیام نیشاپور مین تھا، لیکن بعد کو مشہد مقدسہ رضویہ میں چلے آئے، اور یہان ان کے پیشہ کو بہت زیادہ فروغ حاصل ہوا، اور ان کے مکتب مین زیادہ تر امراء و رؤسا کے بچے تعلیم حاصل کرنے لگے، اور تجربہ نے اون کے مکتب کو بڑا بابرکت ثابت کیا، دولت شاہ نے ان کا تذکرہ کسی قدر

---

[1] دولت شاہ سمرقندی ص ۳۰۰، [2] ص ۳۵۰۔

تفصیل کے ساتھ کیا ہو، اور فن خوشنویسی کے متعلق ان کے تمام کمالات نہایت واضح الفاظ مین نمایان کئے ہین، چنانچہ اس کے خاص الفاظ یہ ہین :-

"مردے مستعد و ذوفنون بودہ اوّل در نیشاپور بودے و بعد ازان در مشہد مقدسہ رضویہ علیہ السلام والتحیۃ ساکن شد، و بمکتب داری وادیبی مشغول بودے و بشش قلم خط نوشتے و در علم کتابت و ہنر شعر و علم معما در روزگار خود نظیر نداشت و رنگ آمیزی کاغذ و سیاہی ساختن و افشان و تذہیب حق او بودہ و درین علوم رسائل دارد و در انشا و تالیف و ترسل و غیر ذلک صاحب فن بودہ و اولاد اکابر در مکتب او متعلم بودہ اند، و عجیب تجربہ کتب او را مبارک یافتہ اند، و مولنا عبد الحیٔ کہ در خط سیاق و دبیری سرآمدہ است شاگرد مولانا سیمی بودہ"[1]

مولانا سیمی جیسا کہ اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے، فن خوشنویسی کے ساتھ شعر و شاعری کا بھی ذوق رکھتے تھے، غالبًا مولنا کاتبی نے بھی ان کی صحبت[2] یا اس زمانہ کے عام شاعرانہ رجحان سے متاثر ہو کر اس کوچہ مین قدم رکھا، اور غزل گوئی کو خاص طور پر اپنے دل و دماغ کا جولانگاہ بنایا، لیکن بدقسمتی سے استاد اپنے ہونہار شاگرد کے فضل و کمال کو حاسدانہ نگاہ سے دیکھنے لگا، اور اوس کی عداوت پر آمادہ ہو گیا، استاد اور شاگرد دونون شاعر اور خوشنویس تھے، اس لئے صاف طور پر پتہ نہین چلتا، کہ باہم کس فن مین رشک و حسد پیدا ہوا، البتہ کاتبی کے بعض اشعار سے اشارۃً معلوم ہوتا ہو کہ یہ رقابت فن شعر کی بدولت پیدا ہوئی، چنانچہ وہ اشعار یہ ہین :-

میان شہر نیشاپور سیمی　　　چو اشعار ملیح کاتبی دید،

[1] تذکرۂ دولت شاہ سمرقندی ص ۴۱۲　[2] تاہم یہ یقینی ہے کہ وہ شاعری مین ان کے شاگرد نہ تھے بلکہ آتشکدہ مین ان کو مولنا سیمی کا شاگرد لکھا ہو

بمشہد رفت و بر نام خودش بست　　　نمک خورد و نمکدان را بدزدید

لیکن مولانا کاتبی کی شرافت اور حسن ادب نے اس نزاع نے کوئی ناگوار صورت اختیار نہین کی، بلکہ مولینا کاتبی نے اس کو دیکھکر نہایت شریفانہ طور پر مولینا سیمی سے علیحدگی اختیار کر لی، اور دار السلطنت ہرات مین چلے آئے، اور یہان نہایت عامیانہ زندگی بسر کرنے لگے، اور شعر و شاعری کو اپنا مستقل مشغلہ بنا لیا، اس وقت ہرات کا فرمانروا سلطان بایسنغر تھا، جو ارباب کمال بالخصوص فنون لطیفہ کا بڑا قدردان تھا، چنانچہ دولت شاہ اوس کے ضمنی تذکرے مین لکھتا ہے :-

"و در ہنر پروری و ہنرمندی شہرۂ اقالیم شد، و خط و شعر در روزگار او رواج یافت و ہنرمندان و فضلا را بآوازۂ او از اطراف و اکناف روے بخدمتش آوردند ہنرمندان را عنایتہا کردے و شعرا را دوست داشتے، و در تجمل کوشیدے و ندیمان و جلیسان باظرائف داشتے و از سلاطین روزگار بعد از خسرو پرویز چون بایسنغر سلطان کسے بعشرت و تجمل معاش نکردہ، و شعر ترکی و فارسی را نیکو گفتے، و فہمیدے و بشش قلم خط نوشتے، و این تخلص مرزا بایسنغر راست"

گدائے کوے تو شد بایسنغر　　　گدائے کوے خوبان بادشاہ است[1]

اسکی ہنر پروری کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے، کہ اس کے دربار مین خواجہ یوسف اندکانی ایک مشہور مطرب تھے، سلطان ابراہیم بن شاہرخ نے متعدد بار سلطان بایسنغر سے ان کو طلب کیا، لیکن سلطان نے انکار کیا، ایک بار سلطان ابراہیم نے ایک لاکھ دینار نقد بھیج دیئے، کہ اس کے عوض مین خواجہ یوسف کو بھیجدو، لیکن سلطان کی بلند ہمتی نے اس کو گوارا نہین کیا، اوس نے اپنے بھائی کے جواب مین یہ شعر لکھ کر بھیجدیا،

[1] تذکرہ دولت شاہ سمرقندی ص ۳۵۰،

مایوسفِ خود نمی فروشیم تو سیم سیاہ خود نگہ دار[1]

فنونِ لطیفہ کی اس قدر دانی کی وجہ سے اس دور کے بہت سے مشہور شعرا اوس کے دربار سے وابستہ تھے، چنانچہ دولت شاہ لکھتا ہے :-

"شعرائے کہ در روزگار شاہرخ سلطان بملازمت بایسنغر بہادر مے بودہ اند بابا سودائی است و مولینا یوسف امیری و امیر شاہی سبزواری و مولانا کاتبی ترشیزی، و امیر یمین الدین نزدی لابا رحمہم اللہ"[2]

لیکن یہ قدر دانی محض تفریحی حیثیت نہین رکھتی تھی، بلکہ اوس کے دربار مین شعرا کو شاعری مین ترقی کرنے کا موقع بھی ملتا تھا، کیونکہ سلطان بایسنغر کی عادت یہ تھی، کہ اپنے دربار کے شعرا سے شعرائے قدیم کے مشہور قصائد پر قصیدے لکھوا تا تھا، اور اس طرح ان کے زور طبع کا امتحان کرتا تھا، چنانچہ دور حاضرہ کے ایک مشہور شاعر فرید احول نے رات اور ستارون کے متعلق ایک قصیدہ لکھا تھا جس کا مطلع یہ تھا،

نماز شام کز امواج این دریائے دولابی فرو شد زورق زرین بر آمد طشت سیمابی

یہ ایک نہایت پر زور قصیدہ تھا جس کی نسبت دولت شاہ نے لکھا ہے کہ

"صفتِ انجم و صفتِ طلوع نیر اعظم در آخر قصیدہ بیان می کند، در چرخیات درین قصیدہ کار، باد ارد"۔

اور فرید نے اوس کو ایک ہفتہ مین لکھا تھا، اور اس زود نویسی پر اوس کو ناز تھا، چنانچہ خود کہتا ہے :-

بیک ہفتہ در اصفاہان فرید این شعر انشا کرد عجائب داشت طبع او ازین تیزی و شتابی

---

[1] تذکرہ دولت شاہ سمرقندی ص ۳۵۱، [2] " " ،

سلطان بایسنغر نے بابا سودائی کو اس قصیدہ کے جواب لکھنے کا حکم دیا، اور انھون نے ایک گھنٹے مین اسی شعر کا ایک قصیدہ اوس کے جواب مین لکھدیا، چنانچہ خود کہتے ہین :-

بیک ساعت بگفت این شعر را بابا دو سودائی فرید اندر سپاہان گرچہ گفت آن را بشتابی

دولت شاہ کو اگرچہ اس زود نویسی کا یقین نہین آتا، تاہم اس مین اس کو بھی شبہہ نہین، کہ اونھون نے اس قصیدے کو تھوڑی سی مدت مین لکھا تھا[1]، اسی عادت کے مطابق سلطان نے مولانا کاتبی کو بھی خلاق المعانی کمال الدین اسمٰعیل اصفہانی کے ایک قصیدے کے جواب لکھنے کا حکم دیا، جس کا مطلع یہ تھا،

سزد کہ تاجور آید بوستان نرگس کہ ہست در چمن و باغ مرزبان نرگس

مولانا کاتبی نے اس قصیدہ کے جواب مین ایک نہایت سیر حاصل قصیدہ لکھا، جس کی نسبت دولت شاہ کا بیان ہے کہ

"او جواب کمال را در حد کمال بیان کردہ"،

لیکن مولانا کاتبی کے ہمسرون نے رشک و حسد سے ان کے قصیدے کی بالکل قدر نہین کی اسلئے اونھون نے کبیدہ خاطر ہو کر ظہیر کے ان اشعار سے اپنے دل کو تسلی دی،

ہنر نہفتہ چو عنقا بماند زانکہ نماند کسیکہ باز شناسد ہمائے را از خاد

ہزار بیت بگفتم کہ آب ازان بچکید کہ جز ز دیدہ دگر آبم از کسے نکشاد

ہزار دامن گوہر نثار شان کردم کہ ہیچ کس شبہے در کنار من ننہاد

اور ہرات سے نکل کر پہلے استرآباد اور گیلان آئے، پھر وہان سے دار السلطنت شروان کا رُخ کیا، اور وہان شاہزادہ اعظم امیر شیخ ابراہیم شروانی نے ان کی بڑی قدر دانی کی، اور ایک

---

[1] دولت شاہ سمرقندی ص ۱۷۱،

قصیدہ کے صلہ مین جس کی ردیف گل ہے، دس ہزار دینار شروانی عطا فرمائے، یہ دولت شاہ کا بیان ہے[1]
لیکن مولینا غلام علی آزاد بلگرامی نے ید بیضا مین لکھا ہے، کہ جب مولنا کاتبی نے کمال کے قصیدہ کا جواب
لکھکر میرزا بایسنغر کی خدمت مین گذرانا تو حاسدون کی دراندازی سے خود میرزا نے اسکی طرف بالکل توجہ
نہین کی، بلکہ اوسکی ہنسی اوڑائی، اسلئے مولانا کاتبی نے ناراض ہوکر شروان کا رُخ کیا، اور امیر ابراہیم کی
مدح مین گل کی ردیف کا قصیدہ لکھکر پیش کیا، جس کے صلہ مین اوس نے دس ہزار دینار دئیے، بہر حال
شروان مین مولینا کاتبی نے نسبتہً ہرات سے زیادہ کامیاب زندگی بسر کی، اور جیسا کہ انسائیکلو پیڈیا
آف اسلام مین لکھاہے، وہان بہت دنون تک قیام پذیر رہے، لیکن اس زمانہ کے مذاق کے مطابق
یہان بھی ان کو شاعرانہ معرکہ آرائیون سے سابقہ پڑا، اور مولینا بدر شروانی سے جو شروان اور مضافات
شروان مین بڑے پایہ کے شاعر خیال کئے جاتے تھے، مقابلہ کرنا پڑا، جس کی اہمیت کا اندازہ کاتبی کے اس
قطعہ سے ہوتاہے، جو اونھون نے مولانا بدر شروانی کی شان مین لکھا ہی،

لقب کاتبی دارم اے بدر اما　　محمد رسید اسم از آسمانم،
مرا نام باشد محمد تو بدری　　بانگشت سبابات بر درانم،

مولنا کاتبی اور بدر کی اس معاصرانہ چشمک نے دو فریق پیدا کر دئیے، ایک فریق مولانا بدر
شروانی کو مولنا کاتبی پر ترجیح دیتا تھا، لیکن اہل سمرقند مولینا کاتبی کو ترجیح دیتے تھے،[2]
شروان مین بہت دنون تک قیام پذیر رہنے کے بعد مولینا کاتبی آذربائیجان مین چلے آئے
جہان کا فرمانروا اسکندر بن قرا یوسف تھا، جو جال غاز قرد کی ایک صحرانشین ترکمان قوم سے تھا
اور کسی شاہی خاندان سے تعلق نہین رکھتا تھا،
مولینا کاتبی نے حسب دستور اوس کی مدح مین بھی ایک عمدہ قصیدہ لکھکر پیش کیا، لیکن ایک

---
[1] تذکرہ دولت شاہ سمرقندی ص ۳۰۰، ۲-۳۰۰، [2] تذکرہ مولنا بدر،

غیر متمدن صحرانشین شخص مولانا کاتبی کی شاعری کا کیونکر قدردان ہو سکتا تھا، اوس نے ان کی طرف مطلق
توجہ نہین کی، اور قصیدے کا کچھ صلہ نہین دیا، مولنا کاتبی کو اس ناقدردانی سے نہایت رنج ہوا، او
وہ اسکی ہجو مین یہ قطعہ لکھکر

زن و فرزند ترکمان را گناہ　　ہمچو مادر سکندر بدرائے،
آنچہ ناگاہ ماندہ بود از وے　　داد گاوں بلشکر چغتائے،

اصفہان چلے آئے، اور وہان خواجہ صاین الدین ترکہ علیہ الرحمہ کی خدمت مین حاضر ہوکر ان کے سامنے
علم تصوف کے بہت سے رسالے پیش کئے، اور ان کے فیض صحبت سے دنیا و مافیہا سے بالکل قطع تعلق کر لیا
اس کے بعد اصفہان سے خواجہ صاین الدین علیہ الرحمہ کی اجازت لیکر عراق عجم سے طبرستان اور دار المرز
مین چلے آئے، اور استرآباد مین اقامت اختیار کی، اور بالکل گوشہ نشین ہوگئے، باانیہمہ فرصت کے اوقات
مین نظامی کے خمسہ کا جواب بھی لکھتے رہے، لیکن استرآباد کا سفر مولانا کاتبی کا آخری سفر تھا، جس کے بعد
ان کو سفر آخرت کے لئے کمربستہ ہونا پڑا، چنانچہ ۸۳۹ھ مین یہان سخت طاعون پھیلا، جسکی شدت کا
بیان خود مولنا کاتبی نے ایک قطعہ مین کیا ہی،

زآتش قہر با گردید ناگاہان خراب　　استرآبادے کہ خاکش بود خوشبوتر ز مشک
واندر و از پیر و برنا ہیچ تن باقی نماند　　آتش اندر بیشہ چون افتد نہ تر ماند نہ خشک

اسی آگ کے شعلون کی لپٹ نے مولینا کاتبی کے خرمن حیات کو بھی پھونک دیا، اور انھون
نے ۸۳۹ھ مین وفات پائی، اور یہین امام زادہ معصوم کے مزار مبارک کے باہر جو پنج گوران کے نام سے
مشہور ہے، دفن ہوئے،

اخلاق و عادات | مولینا کاتبی کے اخلاق و عادات مین سب سے زیادہ نمایان چیز سادگی، بے تکلفی،
خاکساری، خودداری، اور فیاضی ہی، وہ اول اول مولینا سیمی کی عداوت کی وجہ سے نیشاپور سے نکلے،

تو گو اس درجہ کو پہونچ چکے تھے، کہ بڑے بڑے دربارون مین ان کی رسائی ہوسکتی تھی، لیکن اونھون نے اپنی سادگی، بے تکلفی اور خاکساری سے مناصب جلیلہ کی کچھ پروا نہ کی، اور نہایت وارستہ مزاجی کیساتھ ادھرادھر مارے مارے پھرے، چنانچہ دولت شاہ لکھتا ہے ،:-

"مولینا یحیی از آنجا کہ شیوۂ ابنای روزگار است بر روزگار او حاسد شدہ، بر وی دل گران گردید، وبعداوت او برخاست، مولانا کاتبی بفراست آن گرانی را دریافت، از نیشاپور قصد دار السلطنت ہرات نمود، وہموارہ بے تعین وتکلف گردیدے، وبشعر وشاعری مشغول بودے، اگرچہ استحقاق تصدر داشت اما در صف نعال ظرفا بسری برد۔"

لیکن باین ہمہ خاکساری دار السلطنت ہرات مین پہونچکر جب اونھون نے سلطان بایسنغر مرزا کی فرمایش سے خلاق المعانی کمال اسماعیل اصفہانی کے قصیدہ پر قصیدہ لکھا، اور حاسدون کی درانداز ی سے سلطان بایسنغر مرزا نے اس قصیدہ کی داد نہ دی، تو وہ اپنی خودداری کی وجہ سے نہایت برداشتہ خاطر ہوئے، اور ہرات کو چھوڑ کر دار السلطنت شروان مین پہونچے، اور شاہزادہ اعظم امیر شیخ ابراہیم شروانی کے دربار مین رسائی حاصل کی، اور اوس نے ان کی نہایت قدر دانی کی، اور بہت سا مال عطا فرمایا، لیکن مولینا کاتبی چونکہ نہایت فیاض واقع ہوئے تھے، اس لئے یہان ان کو جو کچھ مال و دولت ملتا تھا، چند دنون مین سب صرف کرڈالتے تھے،[1]

ایک بار سلطان نے ایک قصیدہ کے صلہ مین ان کو دس ہزار دینار عطا فرمائے لیکن انھون نے صرف ایک ہفتہ مین کاروان سرائے شماخی مین اس رقم کو فقرا، صلحا، اور شعرا وظرفا پر صرف کردیا، اور بعض لوگون نے اس مین سے کچھ رقم چرا بھی لی، ایک بار انھون نے خادم کو حکم دیا، کہ اسی رقم سے ایک عظیم الشان دعوت کا سامان کرے، لیکن ایک من آٹے کی قیمت تک موجو

[1] تذکرہ آتشکدہ مین ان کے متعلق لکھا ہے، کہ" در امر دنیا بسیار لاابالی"

نہ تھی، باورچی نے اسکی اطلاع دی، تو اوس کے متعلق انھون نے یہ قطعہ لکھا:

مطبخی را وی طلب کردم کہ بغراتی بپزد   تا شود زان آش کار ما و مہمان ساختہ
گفت گم وہیمہ گر یابم کہ خواہد داد آرد؟   گفتم آن کو آسیاے چرخ گردان ساختہ[1]

جس سے ان کے توکل واستغنا کا اندازہ ہوتا ہے،

بعض احباب نے ان کو ملامت کی، کہ" ابھی ابھی بادشاہ نے آپ کو دس ہزار دینار عطا فرمائے ہین، اور آپ کے پاس ایک من آٹے کی قیمت بھی نہین ہے، ایسا نہ ہو کہ بادشاہ آپ سے بدظن ہوجائے" مولنا کاتبی نے جواب دیا، کہ" اگر مین بادشاہ کا خزانچی ہون، اور یہ مال میری تحویل مین ہے، تو مین بادشاہ کو اس کا حساب دیدونگا، ورنہ اگر اوس نے مجھ پر احسان کیا ہے، تو مین صرف ایک تنہا شخص تھا، لیکن مین نے ہزارون آدمیون پر اوس مال کو تقسیم کردیا، اگر بادشاہ اپنے اس احسان کو واپس لینا چاہے گا، تو مین اوس شخص کا حوالہ دیدونگا، جس نے مستحقین کو میرا پتہ دیا" اسکے بعد احباب کو مخاطب کرکے یہ قطعہ پڑھا،

زر از برای خرج کند سکہ دار ہین   بدبخت مردکے کہ ورا گرد میکند

اور کہا کہ" اے دوستو! تم شروان شاہ کے خزانے کا غم نہ کھاؤ، کہ وہ اتنی رقم کے خرچ کردینے سے خالی نہ ہوگا، اور میری فکر بھی نہ کرو، اور میری مفلسی پر کبیدہ خاطر نہ ہو، کہ معانی کے خزانے میرے

[1] دیوان مین پورا قطعہ حسب ذیل ہے،:-

مطبخی را وی طلب کردم کہ بغراتی بپزد   تا شود زان آش کار ما و مہمان ساختہ
گفت در چشمم نمی آید بمطبخ ہیچ چیز   غیر آب دیدہ کش جاری غم نان ساختہ
گفتم از یاران ما جو ہیمہ وگم و دقیق   زان کہ ہستت کار خوان سفرۂ نیشان ساختہ
گفت گم وہیمہ گر یابم کہ خواہد داد آرد؟   گفت آنکین آسیاے چرخ گردان ساختہ

ساتھ ہین، اور میری مروت کا سرمایہ کبھی ختم نہ ہوگا"،

اسی فیاضی کی وجہ سے مولانا کاتبی نے ہمیشہ غربت و افلاس مین زندگی گذاری انسائیکلوپیڈیا[1] آف اسلام مین لکھا ہے کہ

"انھون نے تمام زندگی غربت مین گذاری جس کی وجہ یہ تھی، کہ وہ بڑے فیاض تھے، اور اون کو اپنے سرپرستون سے جو کچھ ملتا تھا، چند دنون مین خرچ کردیتے تھے"

غالبًا اسی غربت و افلاس کی وجہ سے بعض اوقات لب قناعت کی مہر سکوت ٹوٹ جاتی تھی، اور زبان پر حرف سوال آجاتا تھا،

خسروا از خود و پوشش من نداری آگہی | چون نباشد از تو ہر دم نالہ و افغان مرا
نیستم کعبہ کہ در سالے دہی یک جامہ ام | مایم گردون کہ روزے بس بود یکسان مرا

تصنیفات مولینا کاتبی کی تصنیفات کا اکثر حصہ نظم مین ہے، لیکن نثر مین بھی ان کے چند رسالے ہین، جن کا اجمالی ذکر دولت شاہ نے ان الفاظ مین کیا ہے، :-

"واز تبریز عزیمت اصفہان نمودہ بصحبت شریف مفخر الفضلاء والمحققین خواجہ صاین الدین ترکہ علیہ الرحمۃ مشرف شد و در علم تصوف پیش خواجہ رسالہا گذرانید و تربیتہا یافت"

ان کے ایک اور رسالہ کا نام "سی نامہ" ہے، جو ان کے ۳۰ مکاتیب کا مجموعہ ہے، اور اس مین صوفیانہ محبت کا بیان ہوئے لیکن افسوس ہے کہ یہ رسالے ہمارے پاس موجود نہین ہین، اس لئے ہم ان پر لفظی اور معنوی حیثیت سے کوئی تبصرہ نہین کرسکتے، البتہ انھون نے مثنوی مجمع البحرین کے شروع مین خود ایک دیباچہ لکھا ہے جس سے ان کی انشا پردازی اور عبارت آرائی کا اندازہ ہوتا ہے، چنانچہ ہم اس موقع پر اس کے بعض اقتباسات نقل کرتے ہین، :-

[1] انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ذکر کاتبی،

بسم اللہ الرحمن الرحیم

"بالحول والقوۃ" مدام از حضرت مبلغ الہام متکلم بر دوام تعالی شانہ جواہر زواہر صلوات و یواقیت مواقیت تحیات نثار روزگار سخن گذارے باد کہ بیان مصحح انا افصح وکلام منظم اوتیت جوامع الکلم اجناس سپاس ذات پاک را بر طبق ما عرفناک ونسق سبق بعضی احماد بر ورق اگرچہ در مظاہر اسرار افکار فضلاے بلاغت دثار و شعراے فصاحت شعار از جیب و گریبان روزگار ید بیضاے موسوی نمودہ و باقلام اختراع و ارقام اصطناع بر صحائف لطائف معنوی صورہاے معنوی کشودہ اند"

جس سے معلوم ہوگا، کہ اس دور مین مسجع و مقفی نثر نگاری کا جو عام رواج ہوگیا تھا، اوس مین وہ اپنے حریفون سے پیچھے نہ تھے،

نظم مین ان کا جو کلام ان کے قلمی کلیات مین ہمارے سامنے موجود ہے، ان مین متعدد مثنویان ہین جن کے نام یہ ہین،

خمسہ : اوپر گذر چکا ہے کہ استرآباد کے زمانہ قیام مین مولنا کاتبی نے خمسہ نظامی کا جواب لکھنا شروع کیا تھا، اور دولت شاہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مخزن الاسرار کے اکثر حصہ کا جواب لکھ چکے تھے، جس کو اکابر نہایت پسند کرتے تھے، لیکن انسائیکلوپیڈیا آف اسلام مین ہے، کہ وہ صرف گلشن ابرار (جو مخزن الاسرار کا جواب ہے) اور لیلی مجنون کی تکمیل کرسکے، اور لیلی مجنون کا ایک نسخہ سینٹ پیٹرسبرگ مین ہے، اس کی نسبت مسٹر براؤن لکھتے ہین، کہ

"اخیر زندگی مین اونھون نے خمسہ لکھنا شروع کیا، جس مین اونھون نے تصنع و آرایش کو راہ دیا، اسی وجہ سے وہ اوس کو پورا نہ کرسکے"

مثنوی مجمع البحرین :- دو مختلف وزن، اور دو مختلف قافیون مین ایک رزمیہ نظم ہے،

مثنوی ناظر و منظور :- انسائیکلوپیڈیا آف اسلام مین ہے، کہ اس مین دو شخص ناظر و منظور کی صوفیانہ محبت کا ذکر ہے،

بہرام گل اندام[1] :- مسٹر براؤن اسکی نسبت لکھتے ہین کہ "اسکو انھون نے نئے نئے صنائع مین لکھا ہے، مثلاً ذوالبحرین، ذوقافیتین، اور اسی قسم کے دوسرے صنائع"

مثنوی حسن و عشق :- مسٹر براؤن نے اس کا نام لیا ہے،

نظم دلربائی :- انسائیکلوپیڈیا آف اسلام مین ہے، کہ اس مین مجازی طور پر شاہ مین قی داور اوس کے وزیر کی تاریخ ہے، اور اوس مین تراکیب کی فراوانی ہے

دہ باب و تجنیسات :- اخلاقی اور عشقیہ شاعری مین ہے،

دیوان :- مسٹر براؤن کے پاس مولنا کاتبی کے دیوان کا ایک قدیم نسخہ تھا، جو کاتبی کی وفات کے بعد ۹۲۳ھ مین لکھا گیا ہے، اس مین تین ہزار اشعار ہین، جو غزلیات، قطعات، اور متفرقات پر مشتمل ہین، اور متفرقات مین زیادہ تر ان کی زندگی کے حالات ہین،

ان مختلف نظمون کا مجموعہ کلیات کی صورت مین ہمارے سامنے ہے،

---

[1] تذکرہ میزان الغرائب سے معلوم ہوتا ہے کہ بہرام اور گل اندام الگ الگ دو مثنویاں ہیں،

اورنگزیب کی تاریخ کا ایک غیر معروف ماخذ

مثنوی آشوب ہندوستان

از جناب قاضی احمد میاں صاحب آختر جوناگڈھی

"مندرجہ ذیل مقالہ میرے اس انگریزی مقالہ کا ترجمہ ہے جو آل انڈیا اورنٹیل کانفرنس کے اجلاس نہم منعقدہ ۲۵ر دسمبر ۱۹۳۷ء بمقام ٹریونینڈرم (ٹراونکور) کے شعبۂ تاریخی میں پڑھا گیا تھا:" "اختر"

تمام دنیا کے سلاطین اور فرماں رواؤں میں شہنشاہ اورنگزیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کی تاریخ سے متعلق جتنی کتابیں تصنیف ہوئی ہیں، شاید ہی کسی اور بادشاہ کی نسبت لکھی گئی ہوں گی، تاریخ اورنگزیب کے متعدد ماخذ نکلتے چلے آتے ہیں اور ان میں آئے دن ایک نہ ایک اضافہ ہوتا رہتا ہے، اسی سلسلہ میں ہم تاریخ اورنگزیب کے ایک ایسے ماخذ کو پیش کر رہے ہیں جس کے موجود و محفوظ ہونے کا اگرچہ ہمیں علم ہے، لیکن جہاں تک ہمیں معلوم ہے معاصر مورخین میں سے کسی نے اس کو تاریخی ماخذ کی حیثیت سے استعمال نہیں کیا، اور نہ تاریخ عالمگیر کی موجودہ فہرست ماخذ میں اس کا ذکر پایا جاتا ہے[1]، یہ ایک فارسی

---

[1] اورنگزیب کی تاریخ کے تقریباً تمام فارسی ماخذ کے نام سر جدوناتھ سرکار کی تاریخ اورنگزیب اور پروفیسر نجیب اشرف کے مقدمۂ رقعات عالمگیر میں دیئے گئے ہیں، جن میں اس مثنوی کا نام نہیں پایا جاتا،

مثنوی مسمیٰ بہ آشوب ہندوستان ہے، جس پر آیندہ سطور میں تبصرہ کرنا مقصود ہے،

مخطوطات اس کتاب کے قلمی نسخے ہندوستان اور یورپ کے کتب[1] خانوں میں بہت کمیاب ہیں، عجائب خانۂ برطانوی کے کتب خانہ میں ع ۲۶۲۳۵ پر اس کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے، جس کا ذکر ڈاکٹر ریو (Riu) نے اپنی فہرست مخطوطاتِ فارسی[2] میں کیا ہے، یہ ۶۰ ورق یا ۱۲۰ صفحات اور ۵½ × ۱۰ کی تقطیع کا ہے، جس کے ہر صفحہ پر ۱۰ شعر لکھے ہوئے ہیں، خط نستعلیق ہے، جس کی نسبت اٹھارہویں صدی کی تحریر ہونے کا قیاس کیا گیا ہے،

انڈیا آفس کے کتب خانہ میں اس کا ایک اور قلمی نسخہ موجود ہے، اس کا ایک نامکمل مخطوطہ آکسفورڈ[3] کی بوڈلین لائبریری میں محفوظ ہے، ان دو مکمل اور ایک ناقص نسخوں کے علاوہ ایک چوتھا مخطوطہ حال میں ہمارے ایک دوست[4] کو ہاتھ لگا ہے، جس پر ہمیں اپنے اس مضمون میں تبصرہ کرنا ہے،

مطبوعہ نسخے یہ معلوم کر کے تعجب ہوتا ہے کہ اس قدر نایاب ہونے کے باوجود اس مثنوی کے دو مطبوعہ نسخے موجود ہیں، جن میں سے ایک مطبوعہ ۱۳۰۰ھ کتب خانہ آصفیہ (حیدر آباد) کے شعبۂ تاریخ فارسی میں نمبر ۵۰۹ پر[5] جس میں مصنف کا نام "بہشتی شیرازی" بتایا گیا ہے، اور دوسرا نسخہ مطبوعہ ۱۸۸۳ء لاہور کی پبلک لائبریری میں بتایا جاتا ہے[6]، یہ دونوں مطبوعہ نسخے ایک ہی اشاعت کے معلوم ہوتے ہیں، کیونکہ ہجری اور عیسوی سنہ ایک دوسرے سے مطابق پائے جاتے ہیں،

---

[1] ہندوستان میں بانکی پور، ایشیاٹک سوسائٹی (کلکتہ)، بوہار، رامپور، علی گڑھ، پشاور، پنجاب یونیورسٹی، بمبئی یونیورسٹی، ایشیاٹک سوسائٹی (بمبئی) اور یورپ کے انگلینڈ، فرانس اور جرمنی کے کتب خانوں میں اس مثنوی کا کوئی مخطوطہ موجود نہیں ہے،

[2] جلد دوم صفحات ۶۹۰-۶۸۹ [4] جناب عبد الرحمن خانصاحب پٹھان (علیگ) ناظر مساجد و اوقاف ریاست جوناگڑھ [5] فہرست کتب خانۂ آصفیہ جلد ۱ ص ۲۵۲،

[6] کتب خانۂ آصفیہ میں جا کر ہم نے اس مطبوعہ نسخہ کی تلاش کی، مگر وہ وہاں سے غائب تھا، اسی طرح لاہور کے کتب خانہ میں بھی وہ ہمیں نہ ملا،

ہمارا مخطوطہ یہ چھوٹی سی جلد ۵ × ۸ کی تقطیع پر ۲۰۸ اوراق یا ۴۱۶ صفحات کی کتاب ہے، ہر صفحہ میں ۱۲ اشعار ہیں، کل اشعار کی تعداد ۲۵۷۰ (دو ہزار پانچ سو ستر) ہے، ہر صفحہ پر سیاہ و سرخ لکیروں کی جدولیں ہیں، عنوانات تمامتر سرخ روشنائی سے لکھے ہوئے ہیں، کتاب خوش خط اور نستعلیق ہے، خط بہت پختہ اور صاف ہے، بعض اشعار میں الفاظ کو کاٹ کر حاشیہ پر ان کی تصحیح کی گئی ہے، غالباً مالک کتاب یا کسی پڑھنے والے نے کسی دوسرے نسخے سے اسکی تطبیق کر کے تصحیح کی ہوگی، ہر صفحہ کے آخر میں آیندہ صفحہ کا ایک لفظ لکھ دیا گیا ہے، صفحات کا نشان نہیں دیا گیا، کتاب کا نام سرورق، اول یا آخر کتاب میں نہیں لکھا گیا، بلکہ مثنوی کے اس آخری شعر سے معلوم ہوتا ہے،

شد این نامہ از ہمتِ دوستاں مسمیٰ بآشوب ہندوستاں،

تاریخِ کتابت اور کاتب کا نام عبارت مندرجۂ ذیل سے معلوم ہوتے ہیں جو آخر کتاب میں درج ہے:-

"کاتب الحروف محمد حسین بیست و ہشتم شہر رجب المرجب ۱۰۹۶ھ تحریر یافت"

اس مثنوی کی تاریخ تصنیف کا پتہ نہیں چلتا، لیکن یہ ۱۰۶۸ھ اور ۱۰۷۵ھ کے مابین لکھی گئی ہے، جیسا کہ ہم آگے چل کر بیان کریں گے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مخطوطہ تصنیفِ کتاب کے صرف ۲۸ برس بعد لکھا گیا ہے،

آخر کتاب میں حاشیہ پر لکھا ہے "این کتاب دولہ رائے" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ دولہ رائے کی ملکیت میں تھا جو جوناگڑھ کے ایک ذی علم برہمن، چھتری اور دیسائیوں کے خاندان سے تقریباً ڈیڑھ سو برس پہلے گذرے ہیں،

مصنف اس مثنوی کے مصنف کا کوئی حال معلوم نہ ہو سکا، سوائے اس کے کہ اس کا تخلص "بہشتی" تھا جو اس کتاب میں مندرجۂ ذیل تین اشعار میں پایا جاتا ہے:-

(۱) خدایا بہشتی ثنا خوانِ تست ، گیاہی ضعیفی ز بُستانِ تست

(۲) بہشتی کند گر صفاتش بیاں چو تیغش ز پولاد باید زباں

(۳) بہشتی بمدحِ امامِ زمن چو صاحب سخن کرد ختم سخن

اس عہد کے فارسی شعراء کے تذکروں میں بھی اس کا کہیں پتہ نہ مل سکا، مطبوعہ نسخہ مثنوی سے صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے، کہ وہ ایرانی الاصل اور شیراز کا رہنے والا تھا، وہ مذہبًا شیعہ اور اثنا عشری معلوم ہوتا ہے جیسا کہ اس کے اشعارِ ذیل سے ظاہر ہوتا ہے:۔

علی ولی او بیار ادلیل نبی را وصی و خدا را وکیل

بمدحِ امامانِ اثنا عشر مرا ساز نخلِ بیاں باردر

اشعارِ ذیل سے معلوم ہوتا ہے کہ بہشتی شہزادہ مراد بخش کا درباری شاعر تھا، اور اُس کی مدح میں اشعار لکھا کرتا تھا، چنانچہ اس مثنوی میں ایک جگہ کہتا ہے:۔

بوصفِ حسیناں مدہ فرصتم کہ از فکر بیہودہ در زحمتم

مراد جہانست چوں سرورم زخود کرد لطفش ثنا گسترم

پہلے شعر میں "وصف حسیناں" سے پتہ چلتا ہے کہ وہ غزلیات بھی لکھتا تھا، جو شعرائے عجم کا عام طور سے مشغلہ رہا ہے، اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ اس نے اپنی ایک کلیات بھی یادگار چھوڑی ہے، جس کا ایک قلمی نسخہ اڈنبرا کے کتب خانہ میں محفوظ ہے، شہزادہ مراد بخش کی سرپرستی میں رہ کر بہشتی اپنے آقائے ولی نعمت کی مدح و ثنا میں طب اللسان نظر آتا ہے، کبھی تو اس کو "مراد جہاں" کے لقب سے یاد کرتا ہے، اور کبھی "مراد دو عالم" کہکر پکارتا ہے مثلاً:۔

زآں تمر شاہ گیتی ستاں بیامد شہی چوں مراد جہاں

جیسا کہ مثنوی لکھنے والوں کا عام دستور ہے، مصنف نے کتاب کے شروع میں مراد کی مدح کا خاص عنوان قائم کرکے، اپنے دیگر ہم پیشہ مدح سراؤں کی طرح اس کی جا و بیجا مدح و ستائش کی ہے، چنانچہ مراد بخش کی "مذہبیت" سے متعلق مصنف ہمیں صرف پہلی مرتبہ روشناس کراتا ہے:۔

زعصیاں گریزاں زطاعت قریں بود بے سخن شاہ دنیا و دیں

دلش غنچۂ گلشنِ معرفت زشاہاں ندارد کسی ایں صفت

شب و روز بر سنتِ مصطفےٰ بہر کار شرعش بود رہنما

چناں شرع دارد بعہدش رواج ز ادیانِ باطل ستاند خراج

لیکن تاریخ سے اس کی تائید نہیں ہوتی، بلکہ اس کے برعکس ہمیں اس بات کا علم ہوتا ہے، کہ مراد ایک سپاہی منش اور سرکش طبیعت کا آدمی تھا، وہ عیش و عشرت کا طالب اور زیادہ تر اپنا وقت عیش پرستی اور لہو و لعب میں گزارتا تھا، اس لئے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ وہ سنت نبوی کا پیرو اور احکام شریعت کا پابند تھا، اس کو سوائے شاعرانہ مبالغہ کے اور کیا کہا جا سکتا ہے،

خود مصنف کا بیان ہے کہ اس نے اپنے آقائے ولی نعمت کے حالات میں ایک قرن (غالبًا دس سال) کے اندر کئی چیزیں تصنیف کی تھیں، اور کہ "آشوب ہند" اسکی پہلی تصنیف نہیں ہے:۔

زاحوال آں قبلۂ راستاں زیک قرن گفتم بسی داستاں

کنوں فکر تصنیف دیگر کنم زآشوب گیتی سخن سر کنم

تمام لڑائیاں اور دیگر واقعات جو شاہجہاں کے چاروں شہزادوں کے مابین تخت دہلی کے حصول کے لئے رونما ہوئے، اُن کی نسبت مصنف کا دعویٰ ہے کہ وہ سب اس کے

چشمدید ہیں، چنانچہ شاہنامہ سے اپنی مثنوی کا مقابلہ کرتے ہوئے وہ اپنے تئیں فردوسی پر ترجیح دیتا ہے، کہ جس نے اپنے مشاہیر کے کارناموں اور لڑائیوں کا بیان اپنی آنکھوں سے دیکھے بغیر قلم بند کیا ہے:۔

بسی سال فردوسئ خوش کلام	کہ بادش زیزداں درود و سلام
ہمہ رزم شہنامہ نا دیدہ گفت	بجائے گہر طبعش الماس سُفت
من ایں رزمہارا ہمہ دیدہ ام	زکس ہمچو افسانہ نشنیدہ ام
چو افسانہ کذبت شیریں تراست	ولی صدق را نشاۂ دیگر است

کتاب میں بعض اشارات ایسے پائے جاتے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ مصنف گجرات میں رہ چکا ہے، اولاً یہ امر یقینی ہے کہ وہ مراد کا درباری شاعر تھا، اور یہ ظاہر ہے کہ اس وقت مراد احمد آباد میں تھا، جہاں اسنے "مروج الدین" کا لقب اختیار کرکے تخت نشینی کی رسم ادا کی تھی، ثانیاً وہ علامہ طوسی (خواجہ نصیر الدین) کی ایک پیشین گوئی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے، کہ گجرات سے کچھ لوگ حج کو گئے تھے، وہ اسی سال واپس آئے، چنانچہ ان کی زبانی یہ واقعہ سنا،؛ وغیرہ، ان دونوں باتوں سے ثابت ہوتا ہے، کہ اگرچہ احمد آباد میں اس کا مستقل قیام نہ رہا ہو، لیکن وہ کم از کم اتنے عرصہ تک وہاں مقیم رہا ہوگا، جب تک کہ شہزادہ مراد بخش گجرات میں تھا،

تاریخ تصنیف | اس مثنوی کی تاریخ تصنیف کا ذکر متن کتاب میں کہیں نہیں ملتا، البتہ بعض تاریخی واقعات جو اس میں بیان کئے گئے ہیں ان کی بنا پر یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب ۱۰۶۸ھ اور ۱۰۷۰ھ کے مابین لکھی گئی ہوگی، اولاً یہ کہ مراد کی وفات کا ذکر اس میں نہیں کیا گیا صرف اس کو قید کرکے گوالیار کے قلعہ میں بھیج دینے کا حال درج ہے، جو ۴ رشوال ۱۰۶۸ھ

کو واقع ہوا، ثانیاً کتاب کے آخر میں دارا شکوہ کی گرفتاری اور اس کے قتل کا واقعہ بیان کیا گیا ہے، جو ۲۱ ر ذی الحجہ ۱۰۶۹ھ کو پیش آیا، ان قرائن کی بنا پر ۱۰۶۹ھ یا ۱۰۷۰ھ کو اس کتاب کی تاریخ تصنیف سمجھنا چاہئے، یعنی مراد کی وفات سے بہت پہلے اور دارا کے قتل کے فوراً بعد،

فہرست مضامین | موجودہ نسخہ میں سرخ روشنائی سے حسب ذیل عنوانات قائم کئے گئے ہیں، جن کو ہم علی الترتیب یہاں نقل کرتے ہیں:۔

(۱) دیباچہ، حمد و نعت و منقبت،

(۲) در مدح سلطان شاہجہاں (یعنی مراد)

(۳) در مدح شاہجہاں و بخش کردن ولایت بچہار فرزندانِ خود،

(۴) گفتار اندر احداث مرض بہ بدن مبارک شاہجہاں،

(۵) در تدبیر ساختن دارا شکوہ برزم شجاع و فرستادن پور خود، بہ رزم شجاع بطرف بنگالہ،

(۶) حکایت در تمثیل،

(۷) آگاہی یافتن سلطان مراد بخش از مرض شاہجہاں بادشاہ و کشتن علی نقی وزیر خود را،

(۸) بیان تسخیر قلعۂ ارک بہ بندر مبارک (سورت) و بدست آمدنِ مال بسیار از تدبیر شاہ باز،

(۹) گفتار اندر جلوس فرمودن مراد بخش در صوبہ گجرات،

(۱۰) فرستادن دارا شکوہ پور خود را بدفع شاہ شجاع و منصور گردیدن سلیمان شکوہ و ہزیمت شاہ شجاع مرتبہ اول،

(۱۱) لشکرکشیدن سلطان مراد بخش از احمد آباد بصوب اجین و دیدن سلطان اورنگزیب،

(۱۲) گفتار اندر بزم کردن اورنگزیب و مراد بخش،

(۱۳) مصاف انداختن اورنگزیب و سلطان مراد بخش بمقابلۂ مہاراجہ (جسونت سنگھ)

و ہزیمت یافتن او،

(۱۴) لشکرکشیدن ہر دو شہزادہ بطرف اکبرآباد براہ سمانگر (سموگڑھ)

(۱۵) مظفر گشتن سلطان مراد بخش و اورنگزیب و شکست دارا،

(۱۶) مفتوح شدن قلعۂ ارک اکبرآباد و مقید شدن مراد بخش بدست اورنگزیب،

(۱۷) ہزیمت داراشکوہ از لاہور بموجب ناچہاے کید کہ یا مرایے داراشکوہ رسیدہ

بودند و آخر بدگمان شدہ مرتبۂ دویم گریخت،

(۱۸) ہزیمت شاہ شجاع و فتح اورنگزیب و رخصت شدن لشکر،

(۱۹) لشکرکشیدن داراشکوہ از احمد آباد بطرف اجمیر بہ تدبیر مہاراجہ و آخر الامر شکست

یافتن و مرتبۂ سیوم گریختن و بدست جیون زمیندار لاہور مقید گردیدن و آخر کشتہ شدن،

عنوانات بالا کے تحت میں مصنف نے واقعات اور ان کی تفصیلی جزئیات بیان کی ہیں، اور یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ اس نے ان واقعات کو بیان کرنے میں شاعرانہ مبالغہ اور خیال آرائی سے کام نہیں لیا،

تاریخی اہمیت معاصر ہونے کے اعتبار سے مصنف کی معلومات کچھ ذاتی واقفیت اور کچھ سنی سنائی خبروں اور رپورٹوں پر مبنی ہیں، اور جہاں تک برادرانہ معرکہ آرائیوں کا تعلق ہے، یہ کتاب ہمعصر تواریخ کے مقابلہ میں ایک خاص اہمیت رکھتی ہے، اگرچہ واقعات مندرجۂ کتاب عام طور پر اس زمانہ کی نیز مابعد کی تواریخ میں ملتے ہیں، تاہم مصنف کا یہ عام دعویٰ کہ یہ

تمام لڑائیاں اس کی چشمدید ہیں قابلِ قبول نہیں ہو سکتا، یہ صحیح ہے کہ وہ مراد کے دربار سے وابستہ تھا اور اس لحاظ سے مراد کیساتھ جو جو واقعات پیش آئے وہ اسکے چشمدید ہوں لیکن یہ کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ ملک کے دوسرے حصوں میں جو جو واقعات پیش آئے انکو بھی اُس نے بچشم خود دیکھا تھا؟ قدرتی طور پر یہ سب معلومات اسکو پرچہ نویسوں یا افواہوں اور خبروں کے ذریعہ حاصل ہوئی ہونگی، بایں ہمہ اسکے بیانات دوسری معتبر تواریخ کی مطابقت میں اکثر صحت سے قریب تر ہیں،

اورنگزیب کی نسبت رائے مصنف مراد کا نوکر اور اس کا طرفدار تھا، اس لئے طبعًا اس کو اورنگزیب کا مخالف ہونا چاہئے، لیکن پوری کتاب میں اس نے اورنگزیب کے خلاف کچھ لکھنے سے بڑی احتیاط برتی ہے، شاہجہاں کے اپنے چاروں بیٹوں کو چار ولایات (صوبے) تقسیم کرنے کا ذکر کرتے ہوئے مصنف نے چاروں شہزادوں کو خلفاے راشدین سے تشبیہ دی ہے:-

خلف بودش از دولتِ ذو المنن   چو اصحابِ خیر البشر چار تن

بداراشکوہِ جہاں اقتدار   سریرش سزاوار صدیق وار

بآئینِ فاروق سلطان شجاع   زخورشید رایش فروزاں شعاع

ہمی بود شہزادہ اورنگ زیب   چو عثمان سراپا حیاؤ شکیب

زسلطان مراد از نکو اختری   عیاں شوکت و صولتِ حیدری

مصنف کا اورنگزیب کو حضرت عثمانؓ سے تشبیہ دینا قابلِ لحاظ ہے، کہ اس سے ہمارے اس شیعی شاعر کا رجحان اورنگزیب کی طرف ظاہر ہوتا ہے، جس کو اس نے اس طنز نہاں کے پردہ میں چھپایا ہے، دوسری طرف وہ اپنے سرپرست مراد کو حضرت علیؓ سے مشابہت دیتے ہوئے نہ صرف اس کو دوسروں پر فضیلت بخشتا ہے، بلکہ اس طرح وہ امام ممدوح کو خراجِ فضیلت پیش کرتا ہے، بہر حال یہ مشابہت بالکل بیجا اور نا مناسب ہے، اور مصنف نے اس پردہ میں اورنگزیب

کے خلاف اپنے مذہبی بغض و عناد کو چھپایا ہے، بعض اور مقامات پر بھی اس نے اورنگ زیب
کے خلاف زہر اُگلا ہے، لیکن ایسا کرنے میں اُس نے بڑی احتیاط سے کام لیکر
دوسروں کی زبانی ان خیالات کو ادا کیا ہے، صرف ایک جگہ شجاع کے سپہ سالار
اللہ وردی خاں کو لالچ دیکر اپنی طرف کر لینے پر وہ اورنگ زیب کے خلاف علانیہ طور پر لکھتا ہے:۔

چو اکثر فتوحاتِ اورنگ زیب ۔۔۔ بسحر و فسوں بود و مکر و فریب

با ایں ہمہ وہ اورنگ زیب کی دور بینی اور حکمت عملی کا بڑا معترف اور مداح نظر آتا ہے،
چنانچہ رقمطراز ہے:۔

ز تدبیر و فرہنگ اورنگ شاہ ۔۔۔ کہ از کودکی دادہ بودش اللہ

اسی طرح مراد کی قید ہو جانے کا ذکر کرتے ہوئے اور مراد اور اورنگ زیب کا مقابلہ کرتے
ہوئے وہ لکھتا ہے، کہ کسی بادشاہ کے چاروں طرف کئی دشمن ہوں تو اس کے لئے مکر و تدبیر
سے کام لینا جائز ہے، چنانچہ لکھتا ہے:۔

شہے را کہ بسیار باشد عدو ۔۔۔ بہ نیرنگ و افسوں کند کار او
کند زادۂ شاہ شاہنشہی ۔۔۔ گر از کار خود باشدش آگہی
نہ آنکس کہ مانند سلطاں مراد ۔۔۔ ز انجام کارش نیارد بیاد
بد انساں کہ رستم تہور نداشت ۔۔۔ سکندر ز تختش علم بر فراشت

مراد کے قید ہو جانے کے بعد سے اس بات کا ذکر کرتے ہوئے کہ دریائے اٹک سے
لیکر ملک دکن تک تمام ملک اُجاڑ اور ویران ہو گیا ہے، مصنف کے یہ اشعار اورنگ زیب
کی نسبت بہت معنی خیز ہیں:۔

مگر بعد ازیں نیتِ شہریار ۔۔۔ جہاں را کند سر بسر عیش زار

بخیر است چوں نیتِ بادشاہ ۔۔۔ چو جوہر ز پولاد روید گیاہ

مراد سے اگرچہ مصنف کو اپنے ذاتی تعلقات کی بنا پر کافی ہمدردی ہے، اور وہ اس کی فیاضی
شجاعت اور مردانہ اوصاف کا بہت مداح ہے لیکن حکومت و ریاست کے لئے وہ اس کو قابل
اور موزوں نہیں سمجھتا، اس معاملہ میں وہ اورنگ زیب کی نسبت بہت بلند رائے رکھتا ہے،
دارا کے طرف دار مہاراجہ جسونت سنگھ کے ساتھ ایک فیصلہ کن جنگ کرنے کے لئے اورنگ زیب
مراد کو پیغام بھیجتا ہے، اور دارا کی شکست ہو جانے پر اس وسیع سلطنت کا فرماں روا بنانے
کا وعدہ کرتا ہے، پیغام ملتے ہی مراد احمد آباد سے روانہ ہو جاتا ہے، اور دل میں یہ منصوبے گانٹھ
رہا ہے کہ دارا کے استیصال کے بعد وہ تختِ دہلی پر متمکن ہوگا:۔

گماں اینکہ دارا چو یابد شکست ۔۔۔ بر اورنگِ دہلی بخواہد نشست

اس موقع پر مصنف ایک تجربہ کار سیاست داں کی طرح لکھتا ہے کہ

ندانست با آں ہمہ رائے و ہوش ۔۔۔ کہ بی نیش کس را ندادند نوش
چہ خوش گفت رندِ تنک مایۂ، ۔۔۔ کہ ہر کار را ہست پیرایۂ،

اسی سلسلہ میں مصنف مراد کے لشکر کے رذیل افسروں کی نالائقی اور بد کرداری کی
شکایت کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

بود از وزیراں دوات و قلم ۔۔۔ ز نسبۂ عدل و تدبیر و فوج و حشم
چو ارکانِ دولت ارازل بود ۔۔۔ حق پادشہ جملہ باطل بود
بنوعی کہ بود از مراد جہاں ۔۔۔ شود شرح آں در مجالس بیاں

جگت سنگھ کے خلاف حملہ آور ہونے اور بلخ و بدخشاں پر لشکر کشی کرنے کے لئے مصنف نے
مراد کی بڑی تعریف کی ہے، اس کے باوجود وہ اس کو "تخت زریں" پر بیٹھنے اور تاج شاہی پہننے

کے قابل نہیں سمجھا، مراد اپنے حریف اورنگزیب کے ہاتھوں کو مضبوط کرنے کا جو غیر سیاسی اقدام کیا اس پر مصنف اس کو اس طرح ملامت کرتا ہے:-

بالآخر سپہر بریں شاد شد   کہ فرماں دہِ احمد آباد شد،
ولیکن شہنشاہ با عقل و رائے   ہمہ لطف و احسان بخلق خدائے
ندانست ایں نکتۂ دلپذیر   کہ کار شباں نیست تیمار شیر
ز اولاد ہر کس کہ بخت آور است   ہماں لائقِ تاج و تخت زر است
بود دور از شیوۂ خسروی   کہ دعویٰ گر ملک گردد قوی،

مصنف نے اس مثنوی میں بعض واقعات ایسے لکھے ہیں جو عام تاریخوں میں نہیں پائے جاتے، مثلاً:-

(۱) دارا شکوہ کو قید کیا، اس وقت اسکی بڑی شہزادی نے ملک جیون زمیندار لاہور کے پاؤں پڑکر باپ کی رہائی کی استدعا کی، مگر اس گستاخ شخص نے اُسکے نازک چہرے پر تھپڑ مار دیا، اس واقعہ کو اس نے دردناک پیرایہ اور شاعرانہ رنگ میں بیان کیا ہے:-

نہیں دختِ آں شاہ والا جناب   کہ خورشید و ماہش ندیدہ بخواب
چو ہنگامۂ قیدِ دارا شنید   چو آہنگ از پردہ بیروں کشید
چو غنچہ پُر از شکوہ خونیں دہن   چو گل چاک چاکش بہ تن پیرہن،
چو آں گل کہ بر خاک افتد ز باد   بد انگونہ در پائے جیون فتاد
بزارش گفتا کہ اے سنگدل   ز حق ناشناسی ست شیطاں خجل
خوش آنکس کہ از رحمت بگذرد   بدشمن کسی دوست را بسپرد
بدارا کسے بعد ازیں نگرود (؟)   رہا کن بہر جا کہ خواہد رود

مرا باز روز زینت بے شمار   بسلک کنیزانِ مطبخ در آر
مرا دخت پرویز شہ مادر است   پدر آلِ تیمور صاحب فراست
بد بینیاں بجانت کنیزم نسائی   ز پا بندِ زنجیر دارا کشائی
نمود آں پری ہر قدر نالہ بیش   نشد رنجہ آں دیو ز افغان خویش
ز بے مہری و سنگ جانی نمود   رخے ہمچو ماہی بسیلی کبود

(۲) دارا کے قتل کے سلسلہ میں اُس نے یہ بھی لکھا ہے کہ قاتلوں نے پہلے اس کو جام زہر پیش کیا، مگر اس نے پینے سے انکار کر دیا:-

رسانند ابتدا قاتلش جامِ زہر   کہ در کش بحکم شہنشاہ دہر،
ابا کرد و گفتا مرا از نخست   بود با خدا اعتقادم درست
مسلمانم و پیر من مصطفےٰ   چو کفار جاں را سپارم چرا
شدہ سرد از زندگانی دلم   بہر نوع دانی بکن بسملم،

(۳) عالمگیر نے دہلی میں رسم تخت نشینی ادا کی، اسکے چوتھے روز منظر عام میں نکل کر بخشیوں سے کہا کہ فوج میں جتنے قدیم ملازم ہوں سب برخاست کر دیئے جائیں اور انکی جگہ نئے آدمی بھرتی کئے جائیں،

چو روز چہارم گذشت از جلوس   رخ لشکر از درد شد آبنوس
بر آمد چو بر منظر خاص و عام   بفرمود با بخشیانِ عظام
کہ باید سپاہ جدیدی ہمہ   شوند از قدیمی جدا چوں رمہ

ان قدیم نوکروں سے وہ لوگ مراد ہیں جو شاہجہاں، دارا اور مراد کے لشکر میں تھے،

ز شاہجہان و ز دارا شکوہ   ز سلطان مراد و تہور پژوہ
سپہ ہر قدر ہست در ہر طرف   نمایند از نوکری بر طرف،

اس اچانک برطرفی سے لوگوں میں کسقدر تہلکہ مچگیا اور ہزاروں آدمی بے روزگار ہوگئے اسکی نسبت مصنف لکھتا ہے:-

بسے را ہم از نوکری دور ساخت — ہمہ صبح شاں شام دیجور ساخت

بعہدش پریشان وبی روزگار — نشستند چندیں ہزاراں ہزار

ز اولاد صاحب قراں ہیچ شاہ — نبود اینچنیں مہرباں با سپاہ

بعد میں مصنف یہ دعا کرتے ہوئے کہ خدا اسکو عدل خلق اور سخاوت عطا فرمائے،
دولت سے محبت رکھنے پر عالمگیر کو ملامت کرتا ہے :-

خدایش دہد عدل و خلق و سخا — کہ آسودہ باشند خلقِ خدا

شہی راکہ در دل بود مہر زر — چو زر دولتش رود ہر یک دگر

ازاں ماجرا دم نباید زدن — بہ بینم کہ آخر چہ خواہد شدن

یہ اس وقت کا واقعہ ہے کہ جب مراد قید ہو چکا تھا، شجاع بھاگ کھڑا ہوا تھا، اور دارا شکوہ قتل کر دیا گیا تھا، اور ان سب کی فوجوں کے سپاہی اورنگزیب کی فوج میں جمع ہو گئے تھے، اس واقعہ کی صحت میں کلام ہی، اسلئے کہ کسی تاریخ سے اسکی تائید نہیں ہوتی، تاہم اگر اسکو صحیح مان لیا جائے، تو بھی یہ عالمگیر کا ایک دانشمندانہ فعل ثابت ہوتا ہی کہ اس نے اپنے حاسدوں اور جان لیوا دشمنوں کے طرفدار ملازموں کو نکال کر اپنے تئیں خطرہ سے محفوظ کر لیا، واقعی شہنشاہ کے اس دور اندیشانہ سیاسی تدبر کی داد دینی چاہئے، جو اس کو قدرت کی طرف سے عطا ہوا تھا،

آخر میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ مثنوی عالمگیر کے بھائیوں کی جنگ سے متعلق بعض جزئیات و تفصیلات کے لحاظ سے، جو مصنف کی چشمدید اور ذاتی واقفیت پر مبنی ہیں، ایک مفید اور قابل استعمال ذریعہ ہے، اور تاریخ اورنگزیب کے قدیم ماخذ میں ایک معاصرانہ اضافہ ہے، جو اب تک غیر معروف رہا ہے اور روشنی میں نہیں لایا گیا،

"جہان سوز" غوری کا صحیح نام

از

جناب غلام مصطفےٰ خاں صاحب، ایم، اے، ایل ایل بی (علیگ) اسسٹنٹ لکچرر، کنگ ایڈورڈ کالج، امراوتی

علاء الدین "جہاں سوز" غوری (المتوفی ۵۵۲ھ / ۱۱۵۷ء) ان چند بدنصیب حکمرانوں میں سے ہے، جن کے نام ہی کے متعلق مستند و معتبر تاریخوں تک میں اختلاف ہے، اور یہ حکمراں تو ایسا ہے کہ جس کے باپ کے نام میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے، چنانچہ اس کے باپ عزّ الدین یا اعزّ الدین کا نام بعض تاریخوں میں حسن ہی ہے، نظام التواریخ یا تاریخ بیضاوی (مرتبہ حکیم شمس اللہ صاحب قادری صفحہ ۶۲) میں یہی نام ہے اور پروفیسر براؤن نے اپنے مضمون (رائل ایشیاٹک سوسائٹی جرنل، لندن، مورخہ ۸ راکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۸۵۲) میں بھی حسن ہی لکھا ہے، اور اسی صفحے کے حاشیہ پر لکھتے ہیں کہ "اصل متن (راحت الصدور، نسخۂ پاریس) میں علاء الدین حسن بن حسین تھا، لیکن میں علاء الدین حسین "جہاں سوز" ابن عزّ الدین حسن ہی سمجھتا ہوں"۔

ان کے علاوہ عموماً تمام تاریخوں میں علاء الدین کے باپ کا نام حسین ہی پایا جاتا ہے، اور یہی صحیح ہے جس کا ثبوت آگے پیش کیا جائے گا،

اب علاء الدین "جہاں سوز" کے نام کو ملاحظہ فرمایئے، حسب ذیل تاریخوں میں اسکا نام حسن پایا جاتا ہے:-

مرآۃ العالم (از محمد بقا سہارنپوری، ورق نمبر ۱۰۹ الف بانکی پور) نگارستان (از قاضی احمد قزوینی، صفحہ ۲۳۳ بانکی پور) جام جہاں نما (از مہارت خاں، ورق نمبر ۱۳۴ ب بانکی پور) منتخب التواریخ (از بدایونی، طبع کلکتہ، جلد اول صفحہ ۴۲ و ۴۳) تاریخ ابوالخیر خانی (از مسعودی کوہستانی ورق نمبر ۱۱۵ ب بانکی پور)

ان کے علاوہ مغربی مستشرقین نے بھی حسن ہی لکھا ہے، مثلاً:-

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (جلد اول صفحہ ۵۸۶) اور بیلے کی اورینٹل بایوگرافیکل ڈکشنری (صفحہ ۵۰)

لیکن ان تاریخوں کے علاوہ ذیل کی تاریخوں میں حسین پایا جاتا ہے:-

تاریخ گزیدہ (از حمد اللہ مستوفی، حبیب گنج) حدیقۃ الصفا (از یوسف علی، ورق ۲۲۹ ب وغیرہ، بانکی پور) روضۃ الطاہرین (از طاہر محمد سبزواری، ورق ۱۶۳ ا، بانکی پور) جامع التواریخ (طبع کلکتہ صفحہ ۲۷۶) روضۃ الصفا (از میر خواند، طبع لکھنؤ، جلد چہارم صفحہ ۴۸) حبیب السیر (از خواند میر، طبع بمبئی صفحہ ۴۳) خلاصۃ الاخبار (از خواند میر، ورق ۲۵۰ ب، بانکی پور) مجمل فصیحی (از فصیح الخوافی، ورق ۱۲۲ ا و ب، وغیرہ، بانکی پور) منتخب التواریخ (از محمد یوسف الکنعانی، ورق ۱۳۷ ب وغیرہ، بانکی پور) تحفۃ الکرام (از میر علی شیر قانع تتوی، ورق ۱۶۰ ا، بانکی پور) صبح صادق (از محمد صادق اصفہانی، جلد سوم، ورق ۱۱۲ ب، بانکی پور) طبقات ناصری (از منہاج الدین، ورق ۴۸ ب وغیرہ بانکی پور) تاریخ ابن اثیر (لیڈن، جلد یازدہم) تاریخ ابن خلدون (مترجمہ احمد حسین صاحب، جلد یازدہم صفحہ ۱۹۹ وغیرہ) تاریخ فرشتہ (طبع لکھنؤ، جلد اول صفحہ ۵۶ وغیرہ وغیرہ)

بعض مؤرخوں نے حسین اور حسن کے اختلاف کی وجہ سے محض لقب "علاء الدین" ہی پر اکتفا کیا ہے، چنانچہ تاریخ صدر جہاں (از فیض اللہ بنبانی، ورق ۲۹ ب، بانکی پور) برٹش میوزیم کیٹلاگ (از ڈاکٹر ریو، جلد دوم صفحہ ۵۴۰ ا) اور انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (گیارہواں ایڈیشن، جلد یازدہم صفحہ ۹۱۸) میں صرف "علاء الدین" ہی ہے، بہرحال اب مذکورہ بالا مختلف تواریخ کے مختلف بیانات میں سے معلوم یہ کرنا ہے کہ "علاء الدین" کا صحیح نام کیا ہو سکتا ہے، اور کس قول کو معتبر سمجھنا چاہئے؟ میرا خیال ہے، اس کا صحیح نام حسین (بن حسین بن حسن بن محمد بن عباس الخ) تھا، اور اس کے لئے حسب ذیل ثبوت کافی ہیں:

(۱) نظامی عروضی سمرقندی کی تربیت علاء الدین غوری کے دربار سے ہوئی تھی، اس لئے ان جیسے ہم عصر کا قول زیادہ معتبر سمجھا جائے گا، "چہار مقالہ" میں ان سے بعض تاریخی غلطیاں ضرور سرزد ہوئی ہیں،

لیکن یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنے مربی و محسن کا نام ہی بھول جائیں اور غلط لکھ ڈالیں، انھوں نے علاء الدین کا نام، مقالۂ دوم، حکایت اول کے آخر میں ابو علی الحسین بن الحسین ہی لکھا ہے اور یہی نام (الحسین بن الحسین) دوسرے مقام پر یعنی مقالہ چہارم، حکایت دوازدہم میں بھی پایا جاتا ہے اس سے ثابت ہو گیا کہ اس کا نام حسین ہی تھا اور اس کے باپ کا نام بھی (پروفیسر براؤن کے قول کے برعکس) حسین تھا،

(۲) ۵۴۵ھ/۱۱۵۰ء میں جب علاء الدین غوری اپنے بھائیوں (قطب الدین محمد اور سیف الدین سوری) کے قتل کا بدلہ لینے کے لئے بہرام شاہ غزنوی (المتوفی ۵۴۷ھ/۱۱۵۲ء) کے خلاف روانہ ہوا تو بقول صاحب "صبح صادق" (ورق ۱۱۲ ب، جلد سوم بانکی پور) اس نے ایک رباعی کہی جسکا ایک شعر یہ ہے:-

گر غزنیں را زبیخ و بن بر نکنم — پس من نہ حسین[ا] بن حسین[ب] حسنم[ج]

محمد یوسف کنعانی نے اپنی تاریخ منتخب التواریخ (ورق ۲۱۴ ا، بانکی پور) میں اس شعر کے دوسرے مصرع کو اس طرح لکھا ہے:- ع من خود نہ حسین بن حسین حسنم

بہرحال اس سے ثابت ہو گیا کہ (ا) علاء الدین کا نام حسین تھا (ب) اس کے باپ کا نام بھی حسین تھا، اور (ج) اس کے دادا کا نام حسن تھا،

(۳) علاء الدین نے مذکورۂ بالا حملہ جب غزنیں پر کیا تو بہرام شاہ بھاگ کھڑا ہوا[1]، بس پھر کیا تھا، علاء الدین نے دل کھول کر سات دن تک غزنیں پر آگ برسائی، اور جتنے مظالم ممکن تھے سب کر ڈالے،

---

[1] پروفیسر براؤن سے اس جگہ ایک اور غلطی سرزد ہوئی، وہ یہ کہ انھوں نے اپنی تاریخ (جلد دوم ص ۳۰۶) میں لکھا ہے کہ جب اس موقع پر علاء الدین نے غزنیں پر حملہ کیا تو بہرام شاہ تین سال قبل ہی مر چکا تھا، تعجب ہے کہ انھوں نے بعض تاریخوں کو نظامی عروضی جیسے غوری دربار کے تربیت یافتہ شخص اور ہم عصر تذکرہ نویس کے قول پر ترجیح دی، حالانکہ چہار مقالہ (مقالہ دوم، حکایت اول) میں صاف لکھا ہوا ہے کہ "...... و خداوند عالم علاء الدنیا والدین ابو علی الحسین بن الحسین ...... بکین خواستن آں دو ملک شہریار شہید و ملک حمید بغزنیں رفت و سلطان بہرام شاہ از پیش او برفت ......"

یہیں سے اس کو "جہاں سوز" کا خطاب حاصل ہوا جب دل کی بھڑاس نکل چکی تو عیش وطرب کی محفل رچائی، اور یہ سات شعر کہے:۔

جہاں داند کہ من شاہ جہانم — چراغِ دودۂ عباسیانم
علاء الدین حسین بن حسینم — کہ دائم باد ملکِ خاندانم
چو بر گلگونِ دولت بر نشینم — یکے باشد زمین و آسمانم
ہمہ عالم بگردم چوں سکندر — بہر شہرے شہے دیگر نشانم
برآں بودم کہ از اوباش غزنین — چوں رودِ نیل جوئے خوں رانم
ولیکن گندہ پیرانند و طفلاں — شفاعت می کند بختِ جوانم
بخشیدم بایشاں جانِ ایشاں — کہ بادا جانِ شاں پیوند جانم

یہ اشعار معمولی تغیر کے ساتھ منتخب التواریخ (از محمد یوسف، ورق ۳۱۶ ا) طبقات ناصری، (ورق ۱۹ ب) اور لباب الالباب (از محمد عوفی، جلد اول صفحہ ۳۸، ۳۹) میں پائے جاتے ہیں،

ان اشعار میں دوسرے شعر سے بھی صاف ظاہر ہوتا ہے کہ علاء الدین کا نام حسین ہی تھا، اور اس کے باپ کا نام بھی حسین تھا، پہلے شعر کے دوسرے مصرع "چراغ دودۂ عباسیانم" کے متعلق یہ عرض کرنا ہے، کہ علاء الدین کے دادا کے دادا (یعنی حسین بن حسین بن حسن بن محمد بن عباس) کی وجہ سے یہ لوگ عباسی بھی کہلاتے ہونگے، ورنہ در اصل یہ لوگ آل شنسب کہلاتے ہیں، کیونکہ شنسب ان کے اسلاف میں پہلا شخص تھا جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر مسلمان ہوا تھا، ان لوگوں کا سلسلۂ نسب ظالم ضحاک تک پہنچتا ہے، جس کی تفصیل تاریخ فرشتہ، جلد اول صفحہ ۵۴ و ۵۵ سے بھی معلوم ہو سکتی ہے،

تلخیص و تبصرہ
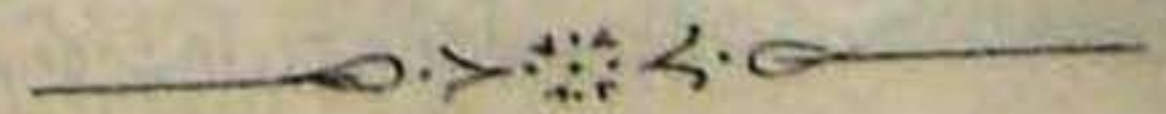
طریقۂ امتحان مین اصلاح کی ضرورت

موجودہ تعلیمی دنیا میں امتحان کے فائدہ ونقصان کے پہلوؤں پر کافی بحثیں ہو رہی ہیں، تعلیم سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ مسئلہ قابلِ غور ہے، ایک جماعت کا خیال ہے کہ آجکل کی تعلیم کتابوں کی رٹائی اور امتحانوں کی زیادتی کے علاوہ کچھ نہیں ہے، طلبہ کی قابلیت اور ان کی ذہانت کی جانچ سوالات اور ان کے جوابات سے کی جاتی ہے، اس طریقہ کے مخالفین کہتے ہیں کہ ایسی تعلیم طلبہ کیلئے سخت مضر اور ان کی تعلیمی ترقی میں سد راہ ہے، ان کی رائے ہے کہ تعلیم کو امتحانات سے بری ہونا چاہئے، لیکن اس صورت میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا امتحانات قطعاً موقوف کر دینے چاہئیں اگر ایسا نہیں کیا جاسکتا تو پھر اس کا حل سوچنا چاہئے،

ماہرین تعلیم کی اکثریت امتحانات کو بکلیم موقوف کر دینے کے موافق نہیں ہے کہ اس کے بعد پھر طلبہ کی قابلیت کے جانچنے کا معیار کیا ہوگا، اس لئے موجودہ امتحان کے طریقوں پر غور کرکے ان کی اصلاح کرنی چاہئے، اس سلسلہ میں حسب ذیل امور قابل غور ہیں،

(۱) امتحانات لحفظ کرنے یا رٹنے کا معیار تو ہو سکتے ہیں لیکن قابلیت کی جانچ کا صحیح معیار نہیں بن سکتے، انٹرنس تک کے امتحانات کا حال تو یہ ہے کہ وہ بازاری نوٹ اور لوگوں کی لکھی ہوئی شرحوں سے رٹ کر پاس کر لئے جاتے ہیں،

(۲) امتحانات سال میں تین بار ہوتے ہیں، ان کے لئے طلبہ سال بھر بدحواس رہتے ہیں، جسکا

ان کے دماغ پر بہت برا اثر پڑتا ہے اور اس سے نفسیاتی حیثیت سے لڑکوں کی ذہنی نشو و نما برباد ہو جاتی ہے،

(۳) تعلیم امتحان کے لحاظ سے دیجاتی ہے، اس لئے قابلیت سطحی ہو جاتی ہے، امتحان کو قابلیت کی جانچ کا محض ایک وسیلہ اور ذریعہ ہونا چاہئے، اسے خود اصل مقصود نہ بن جانا چاہئے،

(۴) بعض اوقات پرچہ ایسے لوگ بناتے ہیں جنھیں ان طلبہ کو پڑھانے کا مطلق تجربہ نہیں ہوتا جنکے لئے پرچہ بنائے گئے ہیں، اس لئے بیشتر پرچے لڑکوں کی قابلیت جانچنے کے بجائے ممتحن کی قابلیت کا نمونہ اور طلبہ کا دل بیٹھا دینے والے ہوتے ہیں۔

(۵) اس سلسلہ میں ممتحنوں کے اختلاف مزاج کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، مختلف ممتحنوں کا معیار مختلف ہوتا ہے، بعض نرمی برتتے ہیں بعض سختی، ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ جوابات کی جانچ عموماً ممتحنوں کے رجحانِ طبع کے تحت میں ہوتی ہے، مسٹر ایچ واٹھ نے ایک مرتبہ لاطینی قواعد کے پرچے مختلف اٹھائیس آدمیوں سے جنچوائے تو ان کے نتائج میں پینتالیس سے لیکر سو فیصدی تک فرق نکلا،

ان باتوں کے پیش نظر اب ان اصلاحوں پر نظر ڈالئے، جو ماہرین تعلیم نے پیش کی ہیں۔

ممالک متحدہ کی تعلیمی کمیٹی نے جو ازسر نو تعلیم کی تنظیم کے لئے قائم کی گئی تھی تمام پہلوؤں پر غور کرکے نصابی امتحان کے بجائے طالب علم کی استعداد کے امتحان کی تجویز پیش کی ہے جس میں عموماً ہاں اور نہیں سے جواب دیا جاسکے، یا معلومات کا اندازہ ہو سکے، یا طلبہ کی قوت استدلال سے ان کی استعداد و قابلیت کا اندازہ کیا جاسکے، یا چند چیزیں دے کر ان کی انتخاب کی صلاحیت کو دیکھا جاسکے،

مگر یہ طریقہ بھی نقص سے خالی نہیں ہے، اس طریقۂ امتحان سے طالب علم کی قابلیت کا اندازہ مطلق نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ تحریری امتحان کی طرح اپنے خیالات کو مجتمع کرکے مرتب طریقہ سے پیش نہیں کرسکتا اس کے علاوہ ایک خرابی یہ بھی ہے کہ ایک مقررہ لمحہ میں اختصار کے ساتھ ایسا جواب دینے میں جسکی ہاں اور نہیں پر کامیابی اور ناکامی کا دارومدار ہو، طالب علم کے دماغ میں اعصابی بےچینی پیدا ہو جاتی ہے،

اس لئے یہ طریقہ موجودہ طریقۂ امتحان کا بدل نہیں ہوسکتا، البتہ اس میں ایک مفید اضافہ ہوسکتا ہے، امریکہ میں یہی طریقہ رائج ہے،

دوسری ترمیم یہ ہوسکتی ہے کہ امتحان زیادہ نہ ہوں، سہ ماہی اور شش ماہی امتحانات بالکل موقوف کردیئے جائیں، اور سال کے اختتام پر ایک امتحان لے لیا جائے، بقول سی پی رائے کے کہ تعلیم ایک نفع بخش سفر ہے، جو نہایت دلچسپ علمی میدانوں سے ہوکر گذرتا ہے، اور امتحان اس سفر کا ایک ضمنی مفید واقعہ ہے، اس سے زیادہ اس کی حیثیت نہیں۔

تیسری چیز یہ قابل لحاظ ہے کہ ممتحن وہی لوگ ہوں جو ان جماعتوں کے پڑھانے کا تجربہ رکھتے ہوں، سوالات اس قسم کے ہوں جن کے جوابات کے لئے رٹائی کی ضرورت نہ ہو، ممتحن کیلئے ایک ضابطہ تیار کیا جائے، جس کے ماتحت وہ طلبہ کی صلاحیت کا اندازہ کرسکیں، ہر کاپی دو دو ممتحن جانچیں، جس طرح اٹلی میں ہوتا ہے، ان دونوں کے اختلاف کا فیصلہ صدر ممتحن کریں، ہر درجہ میں طالب علم کے سال بھر کے کام کا نقشہ ہو، اس سے بھی نتیجہ ترتیب میں مدد لیجائے، زبانی امتحان بھی ضروری ہے، اسکا سلسلہ شروع ہی سے ہونا چاہئے، تاکہ لڑکے ابتدا سے عادی رہیں،

"ب، ا"

ترک اور لاطینی حروف

ٹرکی میں عربی رسم الخط کی جگہ لاطینی حروف کو جاری ہوئے اگرچہ زمانہ گذرچکا لیکن اب بھی وہاں بعض صاحب فکر و نظر اشخاص اپنی تاریخ و تہذیب اور ادب کی واقفیت کیلئے عربی رسم الخط کا جاننا ضروری سمجھتے ہیں، اب بھی کاروبار میں بغیر عربی رسم الخط کی واقفیت کے کام نہیں چلتا، اور حکومت بھی عربی رسم الخط کے واقف کاروں کو ترجیح دینے پر مجبور ہے،

چند دن ہوئے ایک ترک نے مشہور ترکی اخبار جمہوریت کے اڈیٹر یامی بک سے یہ سوال

کیا تھا کہ میرا لڑکا جس کی عمر گیارہ سال ہے، عربی رسم الخط سے بالکل ناواقف ہے لیکن تجارتی کاروبار میں بلکہ حکومت بھی ملازمتوں میں ان لوگوں کو ترجیح دیتی ہے جو لاطینی حروف کے ساتھ عربی رسم الخط میں بھی مہارت ہیں، اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اپنے لڑکے کو عربی رسم الخط کی تعلیم بھی دوں، اس بارہ میں آپ کی رائے کیا ہے، پیامی بک نے اس سوال کے جواب میں اپنے اخبار میں جو مقالہ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے،

میرے نزدیک بھی حکومت کی ملازمت اور آزاد کاروبار دونوں میں عربی رسم الخط سے واقفیت ایک مدت تک ترجیح کا سبب رہے گی، حکومت نے عربی رسم الخط میں لکھنے کی ممانعت کی ہے اس کے پڑھنے کی ممانعت نہیں کی ہے، اس لئے جس باپ کو اپنے لڑکے کی صحیح اور پوری تعلیم مقصود ہو اسے ضرور عربی رسم الخط سکھانا چاہئے،

یہ تو ایک معمولی ضروریات زندگی کے نقطۂ نظر سے ہوا، اس سے زیادہ ثقافتی پہلو سے عربی رسم الخط کا جاننا ضروری ہے اس لئے کہ ترکی زبان کا سارا علمی سرمایہ عربی رسم الخط میں ہے، جو نوجوان اس سے ناواقف ہوگا، اس کو ترکی کی تاریخ اور ادب کا معمولی علم بھی نہیں ہو سکتا، نہ وہ نعیم کی کتابیں پڑھ سکتا ہے نہ پچوی کی کتابیں مطالعہ کر سکتا ہے، نہ جودت پاشا کی تاریخ سمجھ سکتا ہے، ترکی زبان میں اس قسم کی پینتالیس ہزار مطبوعہ اور قلمی کتابیں ہیں، اور یہ سب کی سب عربی رسم الخط میں ہیں جو ترک اس سے ناواقف ہوگا وہ ان کتابوں کے مطالعہ سے بھی محروم رہے گا،

ترکی کے دور ترقی میں بھی جو بے شمار کتابیں لکھی گئیں وہ بھی سب عربی رسم الخط میں ہیں، ضیا پاشا کے زمانہ سے عبد الحق حامد کے زمانہ تک جس قدر نیا لٹریچر پیدا ہوا، ان کا کوئی حصہ لاطینی حروف میں نہیں ہے حتی کہ موجودہ دور کے اکابر مصنفین، یعقوب قدری، فالح رفقی اور خالدہ ادیب کی کتابیں بھی عربی ہی رسم الخط میں ہیں، نئے رسم الخط میں جو چند نام کی کتابیں شائع ہوئی ہیں وہ پرانے سرمایہ کے

کے مقابلہ میں قابلِ ذکر بھی نہیں ہیں، اس لئے جو نوجوان عربی رسم الخط سے ناواقف ہوگا وہ ترکی زبان کے سارے لٹریچر سے ناواقف رہیگا اور اس کی حیثیت روزانہ اور ہفتہ وار اخبارات و رسائل کے معمولی خواندہ سے زیادہ نہ ہوگی، بلکہ ان کے خیالات کو بھی وہ پورے طور سے نہ سمجھ سکیگا، اس لئے کہ ان کے اڈیٹروں کی نشو و نما پہلے دور میں ہوئی ہے، اس لئے ان کے خیالات اور تحریروں کو سمجھنے کے لئے اس دور کی ثقافت اور اس زمانہ کے ماحول کو جاننے کی ضرورت ہے،

شعبۂ نشر و اشاعت کی کانفرنس کی قرارداد کے مطابق، عربی رسم الخط کی کم از کم پچاس ہزار ترکی زبان کی کتابوں کو لاطینی حروف میں منتقل کرنے کی ضرورت ہے اور یہ تعداد وہ ہے جس کا عشر عشیر بلکہ سو پچاس کتابوں کا منتقل کرنا بھی ممکن نہیں ہے، ایسی حالت میں اگر ہماری نئی پود عربی رسم الخط سے ناواقف ہوگی تو وہ کیا پڑھے گی، اس لئے میری رائے میں ہر نوجوان کے لئے لاطینی حروف کے ساتھ عربی رسم الخط کا سیکھنا بھی ضروری ہے کہ تحصیلِ علم کا صرف یہی ایک وسیلہ ہے،

جو لوگ میرے منشا کو صحیح طور پر نہ سمجھیں گے وہ ممکن ہے مجھ پر رجعت کا الزام لگائیں، لیکن میں اس الزام کو خوشی سے قبول کرنے کے لئے تیار ہوں، اس لئے کہ میرے نزدیک کسی انسان کے اپنی قوم کی تاریخ اور اس کے ادب سے جاہل رہنے کے مقابلہ میں رجعت کہیں بہتر ہے،

"م"

دولتِ عثمانیہ جلد اول

یہ مسلمانوں کی زندہ حکومت ترکی کے عروج و زوال اور جمہوریہ ترکی کی مفصل تاریخ ہے، پہلے حصہ میں عثمان اول سے مصطفیٰ رابع تک پانچ صدیوں کے مفصل حالات ہیں، اردو میں ابتک ترکی حکومت کی اس سے زیادہ مبسوط اور مستند تاریخ نہیں لکھی گئی، از مولوی محمد عزیز صاحب ایم اے رفیق دار المصنفین، ضخامت ۴۹۰ صفحے، قیمت ۳ے،

اخبار علمیہ

شہاب ثاقب کی فہرست

جیا گرفیکل سروے آف انڈیا نے حال میں دنیا کے تمام شہاب ثاقب کی ایک مکمل فہرست شائع کی ہے، اتنی مکمل فہرست ابتک دنیا کے کسی ملک میں شائع نہیں ہوئی ہے، گو اس میں ساری دنیا کے شہاب ثاقب کے حالات ہیں، لیکن جو شہاب ثاقب ہندوستان میں گرے ہیں یا یہاں موجود ہیں یا جو کلکتہ کے عجائب خانہ میں ہیں ان کے حالات زیادہ نمایاں حیثیت رکھتے ہیں، کلکتہ کے عجائب خانہ میں ۴۶۸ شہاب ثاقب فراہم کئے جا چکے ہیں جو ساری دنیا کے شہاب ثاقب کے مقابلہ میں زیادہ اہم ہیں، ابتک ساری دنیا میں شہاب ثاقب کی جو تعداد معلوم کی جا چکی ہے وہ ۱۲۵۰ ہے، اس تناسب سے گویا دنیا کے شہاب ثاقب کا ہر تیسرا نمونہ کلکتہ کے عجائب خانہ میں موجود ہے، نمونے چار خوبصورت بکسوں میں رکھے ہوئے ہیں، اور انگریزی، اردو اور بنگلہ میں ان کی تشریح لکھی ہوئی ہے، اور نئے نمونوں کے حصول کی کوششیں برابر جاری ہیں، ان کے ماہرین نمونوں ان کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں، اور سائنسداں دنیا کے استفادہ کے لئے ان کی تحقیقات کا نتیجہ برابر شائع ہوتا رہتا ہے، دنیا کے تمام شہاب ثاقب کی مجموعی تعداد میں سے ۱۹۳ امریکہ کی فہرست سے نقل کئے گئے ہیں، جو وہاں موجود ہیں، ہندوستان میں ان کی تعداد ۱۲۷، روس میں ۹۰، اسٹریلیا میں ۹۵، فرانس میں ۵۰، میکسیکو میں ۵۳ چین میں ۱۰۴ اور دوسرے ملکوں میں ان کی مجموعی تعداد ۳۶ ہے،

اس فہرست میں ان آتش فشاں مادوں اور ان ذرات کے چھینٹوں کا بھی ذکر ہے جو ان شہاب ثاقب

کے گرنے سے پیدا ہوئے تھے، اور شہاب ثاقب کی ماہیت سے بھی بحث کی گئی ہے، ان کی دو خاص قسمیں ہیں، ایک جو عموماً لوہے (نکل) کے ذرات سے بنے ہیں، اور دوسرے جو سلیکا (ایک خاص قسم کا معدنی پتھر) سے، پھر ان میں مختلف درجات ہیں، شہاب ثاقب عموماً ایسے عناصر سے مرکب ہوتے ہیں، جو زیادہ بھاری نہیں ہوتے، یعنی ان میں سونے اور پلاٹینیم کے اجزاء نہیں ہوتے، بڑے قد کے شہاب ثاقب سب کے سب لوہے کے ہیں، ان میں سب سے بڑا جو مغربی افریقہ میں پایا گیا تھا، ۴۵ ٹن کا ہے، پتھر کے شہاب ثاقب زیادہ سے زیادہ ۷۵۰ پونڈ وزن تک کے ہیں، ان میں سب سے زیادہ وزنی جزیرہ لانگ میں گرا تھا، بڑے شہاب ثاقب کے گرنے سے جو آتش فشاں مادے پیدا ہوتے ہیں اس کا اندازہ مشکل ہے،

لوہے سے مرکب شہاب گرتے ہوئے نظر نہیں آئے، بلکہ گرے ہوئے ملے، اور پتھر سے مرکب اکثر گرتے ہوئے دیکھے گئے، ان کے گرنے سے اب تک انسانی جان کا اتلاف سننے میں نہیں آیا، اس قسم کے صرف دو واقعے سنے جاتے ہیں، ایک یہ کہ ۱۸۶۸ء میں ضلع بستی کی ایک عورت پر شہاب ثاقب گرا تھا، جو جل کر کوئلہ ہو گئی تھی، دوسرا ۱۹۳۳ء میں، اس حادثہ میں ایک لڑکا مرا تھا، ان کے اجزاء کے امتحان سے ظاہر ہوا کہ سب سے پہلا شہاب ثاقب جو گر کر سخت ہو گیا تخمیناً انتیس ۲۹ لاکھ سال پہلے گرا تھا، اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اگر شہاب ثاقب نظام شمسی کے بکھرے ہوئے اجزاء ہیں، تو ان کی عمر تیس ۳۰ لاکھ سال سے زیادہ نہیں ہے، لیکن اگر وہ دوسرے سیاروں کے اجزاء ہیں تو وہ کروروں برس کے ہو سکتے ہیں لیکن اندازہ اور تخمینہ سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ نظام شمسی ہی کے اجزاء ہیں،

شہاب ثاقب کی باقاعدہ تحقیقات سب سے پہلے ہندوستان میں ہوئی، دنیا میں شہاب ثاقب مختلف شکلوں میں پائے جاتے ہیں، چنانچہ جو صورت ڈاٹا کے نام سے موسوم ہے تحقیقات سے ثابت

ہوا ہے کہ وہ شہاب ثاقب ہی کے ٹکڑوں سے بنی ہے، ۱۷۹۴ء میں کلادانی نے ایک رسالہ لکھا تھا جس میں
اس نے لوہے کے ایک بڑے تودہ سے جسے پلیس نے سائبیریا میں پایا تھا بحث کی ہے، اور ثابت
کیا ہے کہ یہ تودہ آسمان سے گرا تھا، اس کے دو سال بعد طور سینا پر ایک عجیب چیز آسمان سے گری،
اس سے کلادانی کے خیال کی تصدیق ہوگئی، اسے پر جوزف بنک کے پاس تحفۃً لندن بھیجدیا گیا تھا
۱۷۹۹ء میں بنک نے اسی قسم کی ایک چیز یارک شائر میں گرتے ہوئے دیکھی، یہ دونوں آپس میں
بہت مشابہ ہیں، اس سے ایک سال پہلے اسی قسم کی ایک چیز بنارس میں گری تھی، ۱۸۰۹ء میں ہارڈ
نے ان تینوں کا مطالعہ کرکے ثابت کردیا کہ درحقیقت یہ سب شہاب ثاقب ہیں،

جنین کی صنف میں تبدیلی

فرانس کے ایک ڈاکٹر نے حال میں یہ تجربہ کیا ہے کہ ماں کے پیٹ ہی میں جنین کی صنف کو دریافت کیا
جاسکتا ہے، یہ بھی اس کا دعویٰ ہے کہ جنین کی ابتدائی تشکیل کی حالت میں غذا کی تبدیلیوں سے اسکی صنف کو بدلا
جاسکتا ہے، ابتدائی تجربوں میں اسکو کامیابی ہوئی ہے، آیندہ اور وسیع تجربات زیر عمل ہیں،

امریکہ کی بعض دلچسپ ایجادیں

حال میں امریکہ میں جو دلچسپ ایجادیں ہوئی ہیں، ان میں ایک ایسی عینک ہے جسمیں ایک خاص
قسم کا شیشہ لگا دینے سے پشت کی چیزیں بھی صاف نظر آتی ہیں، ایک کلائی کی گھڑی ہے یہ الارم والی
گھڑی کی طرح بجنے کے بجائے سونیوالے کی کلائی کو دبا کر نیند سے بیدار کرتی ہے، ایک کھڑکی ہے جب
اسے کھول کر کوئی چور داخل ہونا چاہتا ہے، تو وہ اسے دبا کر گرفتار کرا دیتی ہے،

باب التقریظ والانتقاد

تخریج زیلعی

از مولانا حبیب الرحمن صاحب صدر مدرس مدرسہ مفتاح العلوم مئو

فقہ حنفی کی بے شمار کتابوں میں جو مقبولیت ہدایہ کو نصیب ہوئی ہے وہ کسی اور کو شاید ہی نصیب ہوئی
ہو، اس کے جہاں اور بہت سے اسباب ہیں، ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ اس میں احناف کے مسلک کے
ساتھ ساتھ دوسرے ائمہ کے اختلافات اور ہر ایک کے نقلی و عقلی دلائل و شواہد بھی پیش کئے گئے ہیں، لیکن
دلائل نقلیہ کے سلسلہ میں جو حدیثیں ذکر کی گئی ہیں، ان کی سندیں یا ان کے حوالے مذکور نہیں ہیں، نہ انکے
ضعف و قوت کا بیان ہے، نہ ان کے رواۃ پر جرح و تعدیل کی گئی ہے، جو حدیثوں کے لئے نہایت ضروری
چیز ہے، لیکن ہدایہ کے موضوع سے یہ مباحث خارج تھے، اس لئے صاحب ہدایہ کو یہ مباحث نظر انداز
کرنے پڑے، جن خوش نصیبوں کو روایات پر کامل عبور اور فن روایت میں مہارت حاصل تھی، ان کے لئے
تو کوئی زحمت و دشواری نہ تھی، لیکن جو اس کمال سے عاری تھے، ان کو احادیث کے بے پایاں دفتر میں
ان احادیث کی تلاش اور ان کے ضعف و قوت کی تحقیق میں بڑی دشواری پیش آتی تھی،

حق تعالیٰ جزائے خیر دے امام جمال الدین زیلعی کو جنھوں نے ان دشواریوں کا احساس فرمایا
اور نصب الرایہ لتخریج احادیث الہدایۃ کے نام سے ایک نہایت بیش قیمت کتاب تصنیف
فرما کر طالبان تحقیق کو بہت سی صعوبتوں سے نجات دلادی۔

مصنف کے حالات مصنف کتاب جمال الدین زیلعی، آٹھویں صدی ہجری کے ایک بلند پایہ حافظ حدیث، فن روایت اور حدیث و فقہ کے یکتائے روزگار امام تھے، فقہ اور فنون حدیث میں جن اجلۂ ائمہ سے ان کو تلمذ کی نسبت تھی، سب اپنے اپنے فن میں یکتا ماہر و امام تھے، ان میں سے چند کے نام یہ ہیں،

(۱) حافظ ابو الحجاج مزی (جن کے باب میں ذہبی کا قول ہے و اما معرفة الرجال فهو حامل لوائها والقائم باعبائها لم تر العيون مثله یعنی معرفت رجال کے علمبردار ہیں، ان کی نظیر آنکھوں نے نہیں دیکھی، ذہبی ہی کا یہ قول بھی ہے اوضح مشکلات و معضلات ما سبق اليها في علو الحديث و رجاله، علم حدیث و فن رجال کی بہت سے ایسے عقدے انھوں نے حل کئے ہیں جن میں ان کو اولیت و تقدم کا شرف حاصل ہے،

(۲) حافظ شمس الدین ذہبی جن کی نسبت سبکی نے فرمایا خاتم الحفاظ امام العصر حفظا واتقانا،

(۳) علاء الدین ماردینی جن کی وسعت نظر اور اتقان و مہارت کا زندہ شاہکار ان کی تصنیف الجوہر النقی ہے، حافظ ابو الفضل عراقی (حافظ ابن حجر کے استاد) نے انکو الامام العلامة الحافظ قاضی القضاة کے القاب سے یاد کیا ہے (لحظ الالحاظ صد ۱۲۶) حافظ ابو الفضل کو فن حدیث میں جو کمال حاصل ہوا وہ علاء الدین ہی کا فیض تھا، ابن فہد نے تصریح کی به تخرج وانتفع (لحظ الالحاظ صد ۲۲۲) سیوطی نے ان کے حق میں فرمایا ہے، كان اماما في الفقه والاصول والحديث فقہ، اصول اور حدیث میں ان کو امامت کا درجہ حاصل تھا،

(۴) فخر الدین زیلعی، جن کی بے مثل فقاہت اور علمی جلالت کا بین ثبوت کنز کی شرح تبیین الحقائق ہے،

امام جمال الدین زیلعی کو ان اجلۂ فقہاء و محدثین کے فیض صحبت سے حدیث اور فقہ میں جو پایۂ عالی

نصیب ہوا، اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ کل اصحاب تراجم و طبقات نے امام زیلعی کو حفاظ حدیث میں شمار کیا ہے، (دیکھو ذیول تذکرة الحفاظ) سیوطی ان کو "الامام الفاضل المحدث" کے اوصاف سے موصوف، اور ابن فہد "الفقیہ الامام الحافظ" کے القاب سے ملقب کرتے ہیں (ذیول صد ۱۲۶ و صد ۳۶۲ خاتمة الحفاظ)

علامہ ابن حجر عسقلانی فقہی مسلک میں اختلاف کے باوجود ان کو "امام" کے لقب سے یاد کرتے ہیں[۱]، اور اسکا بھی پوری صفائی اور کشادہ دلی سے اعتراف کرتے ہیں کہ "میں نے تلخیص حبیر کی تصنیف میں امام زیلعی کی تخریج سے استفادہ کیا ہے"[۲]، یہ بھی لکھتے ہیں کہ "تخریج کے علاوہ ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے اور بھی بہت سے متفرق علمی فوائد سے مستفید ہوا ہوں"[۳] حافظ ابن حجر جیسے جلیل القدر حافظ حدیث کا یہ کہنا انکی جلالت قدر کی کافی شہادت ہے،

تنہا حافظ ابن حجر ہی پر موقوف نہیں، دوسرے اکابر علمائے شافعیہ نے بھی زیلعی کی تخریج سے بہت فائدہ اٹھایا ہے، چنانچہ حافظ ابن حجر کی تصریح کے موافق، علامہ بدر الدین زرکشی کی تخریج احادیث رافعی، بڑی حد تک تخریج زیلعی کی رہین منت ہے (مقدمہ نصب الرایہ بحوالہ تمیمی)

اور حق تو یہ ہے کہ زیلعی کی جلالت شان، علوئے رتبت اور امامت فن کے ثبوت کیلئے کسی بیرونی شہادت کی مطلق ضرورت نہیں ہے، اس کی سب سے بڑی اور سب سے زیادہ معتبر شہادت خود ان کی کتاب تخریج ہدایہ ہے، یہ ممکن نہیں ہے کہ اسکو دیکھکر کوئی انصاف پسند ان کے وسعت معلومات اور دقت نظر کا معتقد و معترف نہو جائے،

تخریج زیلعی کی اہمیت یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہو کہ زیلعی نے ہدایہ کی تخریج لکھکر مذہب احناف کی بڑی خدمت انجام دی، اور علمائے احناف پر بہت بڑا احسان کیا، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ تنہا احناف ہی ان کے زیر بار احسان نہیں ہیں بلکہ جیسا کہ ابھی اوپر گذرا زرکشی اور ابن حجر جیسے علمائے شافعیہ بھی ان کے رہین منت ہیں،

تخریج زیلعی کی مزیت و ضرورت یوں تو تخریج ہدایہ کے سلسلہ میں کئی کتابوں کے نام لئے جاتے ہیں، لیکن

---

[۱] تلخیص صد ۲ و درایہ صد ۲ [۲] تلخیص صد ۲ [۳] مقدمہ نصب الرایۃ بحوالہ طبقات تمیمی

زیلعی کی تخریج ان سب میں اعلیٰ و ارفع ہے، اور اس باب میں اس کو تقدم و اولیت کا شرف بھی حاصل ہے، امام علاء الدین ابن الترکمانی کی تصنیفات میں تخریج ہدایہ کا نام لینا کسی مصنف کا وہم نہ ہو تو یہ تخریج بیشک زیلعی کی تخریج سے مقدم ہے، لیکن میرے خیال میں واقعہ یوں نہیں ہے، امام علاء الدین نے ہدایہ کی مستقل تخریج نہیں لکھی ہے، بلکہ ہدایہ کی شرح لکھی ہے، اور شرح کے ضمن میں احادیث کا پتہ بھی یقیناً دیا ہوگا، حافظ عبد القادر قرشی ان کے خاص تلامذہ اور حاضر باش شاگردوں میں سے ہیں، وہ جواہر مضیہ میں بسط کے ساتھ ان کے اختصار ہدایہ اور شرح ہدایہ کا ذکر کرتے ہیں لیکن تخریج کا نام نہیں لیتے، حالانکہ اسی مقام پر اپنی تخریج ہدایہ کی تصنیف اور اس کو استاذ کی خدمت میں پیش کرنے کا تذکرہ کرتے ہیں، اگر امام علاء الدین کی کوئی مستقل تخریج ہوتی تو حافظ عبد القادر کو تخریج لکھکر ان کی خدمت میں پیش کرنیکی ضرورت محسوس نہ ہوتی،

اس مقام پر بعض حضرات سے ایک اور وہم بھی سرزد ہوا ہے، وہ یہ کہ انھوں نے امام علاء الدین کی تخریج ہدایہ کا ذکر کرکے یہ بھی لکھدیا کہ اس کا نام کفایہ ہے، حالانکہ الکفایہ ہدایہ کے اس مختصر کا نام ہے جو امام علاء الدین کی تصنیف ہے، قرشی لکھتے ہیں، واختصر کتاب الهدایه بکتاب سماه الکفایه فی مختصر الهدایه، آگے خود امام علاء الدین کا قول نقل کیا ہے، فانی سمیت مختصری للهدایة بالکفایة (صفحہ ۳)

بہرحال امام علاء الدین کیطرف کسی تخریج ہدایہ کی تصنیف کی نسبت میرے نزدیک بالکل غیر محقق ہے، ہاں ان کے شاگرد خاص حافظ عبد القادر قرشی نے بیشک ہدایہ کی تخریج لکھی ہے، اور لکھکر استاد کی خدمت میں پیش کی ہے، یہ واقعہ تو خود قرشی نے لکھا ہے کہ میں نے اپنی تخریج کا نام کفایہ رکھا تھا، جب استاذ کی خدمت میں اس کتاب کو پیش کیا تو انھوں نے از راہ ظرافت فرمایا کہ تم نے یہ نام مجھ سے چرا لیا ہے" اس لئے کہ میں نے اپنی مختصر ہدایہ کا نام یہی رکھا ہے، لہذا یہ نام بدل دو، انھوں نے عرض کی کہ پھر آپ ہی دوسرا نام رکھدیں، چنانچہ انھوں نے ان کی تخریج کا نام العنایه فی معرفة تخریج الهدایه تجویز فرمایا، (جواہر مضیہ ص ۳۶۷)

حافظ عبد القادر بھی آٹھویں ہی صدی کے عالم ہیں، مگر ان کا طبقہ زیلعی سے متاخر ہے، اس لئے گمان ہوتا ہے کہ ان کی تخریج بھی زیلعی کی تخریج سے متاخر ہوگی،

تخریج قرشی کا پتہ علامہ قرشی کی تخریج کے کسی مکمل نسخہ کا پتہ ہم کو نہیں چل سکا، کتب خانہ خدیویہ (مصر) کی فہرست میں بے نام کی ایک تخریج ہدایہ کا ذکر موجود ہے، مرتب فہرست نے اس کے مصنف کا نام محمد بن عبد اللہ بن محمد بن ابی الوفا لکھا ہے اور اس کا سن وفات ۷۷۵ھ بتایا ہے، میرا خیال ہے یہ کتاب العنایه فی معرفة احادیث الهدایه ہے اور مرتب فہرست نے مصنف کے نام و نسب میں غلطی کی ہے، صحیح نام و نسب یوں ہے ابو محمد عبد القادر بن محمد بن نصر اللہ بن ابی الوفا، یہ وہی علامہ عبد القادر قرشی صاحب جواہر مضیہ ہیں، فہرست خدیویہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کا صرف پہلا حصہ جو کتاب النکاح پر ختم ہوتا ہے، کتب خانہ خدیویہ میں موجود ہے، اوراق کی تعداد ۲۱۸ ہے،

بہرحال آٹھویں صدی کے نصف اول میں زیلعی کی تخریج کے ماسوا ان ہی دونوں تخریجوں کا ذکر کیا جاتا ہے، جن میں سے پہلی کا سرے سے تصنیف ہی ہونا غیر محقق ہے، اور دوسری تصنیف ضرور ہوئی مگر متداول نہیں ہے، بلکہ ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ اس کا کوئی مکمل نسخہ کہیں موجود بھی ہے یا نہیں، اس لئے طالبانِ تحقیق کی پیاس بجھانے کے لئے تنہا زیلعی کی تخریج رہ گئی، اس سے اس تخریج کی ضرورت کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے،

باقی رہی حافظ ابن حجر کی درایہ تو اہل علم کو معلوم ہی ہے کہ وہ کوئی مستقل تصنیف نہیں ہے بلکہ یہی تخریج زیلعی کا ملخص و مختصر ہے، پھر یہ تلخیص و اختصار بھی توقع کے خلاف ایسا ہے کہ طالبِ تحقیق کی

اس سے مطلق تشفی نہیں ہو سکتی، اور نہ وہ ان قیمتی معلومات و نادر فوائد سے بہرہ اندوز ہو سکتا ہے جو تخریج زیلعی میں جا بجا منتشر اور اس کتاب کا طغرائے امتیاز ہیں،

تخریج زیلعی کی خصوصیات

امام زیلعی کی تخریج کی بہت سی خصوصیتیں ہیں جن میں سے چند یہ ہیں،

(۱) امام زیلعی التزام کے ساتھ ہر حدیث کی نسبت پہلے یہ بتاتے ہیں کہ اس حدیث کو فلاں محدث نے اپنی فلاں کتاب میں روایت کیا ہے، اس کے بعد اصل کتاب سے پوری سند کے ساتھ پورا متن لفظ بلفظ نقل کرتے ہیں، اور حافظ ابن حجر سند بالکل حذف کر دیتے ہیں، صرف روایت کرنیوالے صحابی کا نام بتا دیتے ہیں، اسی طرح عموماً متن بھی پورا ذکر نہیں کرتے، بلکہ صرف اتنا ہی ٹکڑا پیش کرتے ہیں جس سے مدعا کا تعلق ہوتا ہے،

(۲) امام زیلعی سند و متن نقل کرنے کے بعد عموماً یہ کرتے ہیں کہ اگر کسی محدث نے اس حدیث کی سند یا متن پر کوئی کلام کیا ہے، تو اس کو بتمامہ نقل کرتے ہیں، پھر اگر کسی دوسرے محدث نے اس کا جواب دیا ہے تو اس کو بھی ذکر کرتے ہیں، حافظ ابن حجر عموماً ان باتوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں، مثلاً ابن حجر نے کتاب الحج میں قارن کیلئے دو طوافوں کی ایک حدیث بروایت حضرت عمران نقل کی اور صرف اتنا لکھ دیا کہ دار قطنی نے اس کی علت بیان کی ہے، حالانکہ زیلعی نے پوری تفصیل کے ساتھ دار قطنی کے حوالہ سے اس علت کو لکھا ہے۔ (دیکھو زیلعی ص ۱۱۱ جلد ۳)

(۳) اگر کوئی سند ضعیف یا متکلم فیہ ہوتی ہے، تو امام زیلعی تصریح کے ساتھ پہلے یہ بتاتے ہیں، کہ اس سند میں فلاں مجروح یا متکلم فیہ راوی ہے، پھر اس راوی کی نسبت ائمۂ نقد کے اقوال نقل کرتے ہیں، اور حافظ ابن حجر عموماً یہ کہکر گذر جاتے ہیں کہ یہ سند کمزور ہے، یعنی نہ ضعیف راوی کا نام بتاتے ہیں، نہ اس کے بارہ میں اقوالِ جرح و تعدیل نقل کرتے، مثلاً "عدم جواز نکاح بلا ولی" کے باب میں ابن حجر نے حضرت جابر، حضرت ابن عمر، حضرت عمران، حضرت علی، حضرت انس اور حضرت

عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہم کی حدیثوں کا حوالہ دیکر صرف اسقدر بتا دیا کہ ان کی سندیں بہت کمزور ہیں، حدیث کے الفاظ تک نہیں بتاتے، اور امام زیلعی نے حدیث کے الفاظ نقل کئے، سند ذکر کی، پھر مجروح راوی کی تعیین کی اور سب سے آخر میں محدثین کے اقوال بھی اس کے باب میں نقل کئے، (دیکھو زیلعی ج ۳ ص ۱۸۹)

(۴) امام زیلعی اصولِ حدیث کے بعض بعض مسائل کے متعلق بڑی نادر تحقیقات ذکر کر جاتے ہیں، حافظ ابن حجر اس کو بالکل چھوڑ جاتے ہیں،

(۵) امام زیلعی کا ایک التزام یہ بھی ہے کہ جس حدیث کی تخریج کرتے ہیں اگر اس کے ہم معنی دوسری حدیثیں ہوتی ہیں تو ان سب کو سند و متن کے ساتھ بالتفصیل ذکر کرتے ہیں، لیکن حافظ ابن حجر بہتیرے مقامات میں صرف اتنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ اس باب میں فلاں صحابی کی بھی ایک حدیث ہے، جس کو فلاں محدث نے فلاں کتاب میں بیان کیا ہے، مثلاً حدیث التراب طهور المسلم کی تخریج کے بعد لکھتے ہیں، کہ اس باب میں ابو ہریرہ کی ایک روایت بھی ہے جو معجم اوسط طبرانی و مسند بزار میں مذکور ہے، لیکن امام زیلعی پہلے بزار کا حوالہ دیکر ان کی پوری سند اور لفظ بلفظ پورا متن بلکہ اس کے بعد بزار نے حدیث کی غرابت کا جو بیان اور اپنے شیخ کی جو توثیق کی ہے، اس کو بھی نقل کرتے ہیں، پھر اسی بسط و تفصیل کیساتھ طبرانی کی سند اور ان کے الفاظ میں حدیث کا پورا متن نقل کرتے ہیں، (دیکھو زیلعی ص ۱۳۹ ج ۱)

یہاں تخریج زیلعی کی خصوصیات کا استقصا مد نظر نہیں ہے، یہ چند باتیں بطور نمونہ اس لئے ذکر کر دی ہیں، کہ کتاب کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے میں مدد مل سکے،

اگر میرے معروضات آپ نے غور سے پڑھے ہیں تو آپ کو اقرار کرنا پڑے گا کہ تخریج زیلعی یقیناً شائقین حدیث کیلئے ایسی ضروری چیز ہے کہ کوئی طالب حدیث اس سے کسی طرح مستغنی نہیں ہو سکتا،

زیلعی کا پہلا اڈیشن

اس زمانہ میں جب تک کوئی کتاب چھپ نہ جائے، اس وقت تک تعمیم نفع ناممکن اور اس کا بسہولت حاصل ہونا سخت دشوار ہے، اس لئے ضرورت تھی کہ کوئی

صاحبِ توفیق اس کو چھپوانے کی ہمت کر کے اس گوہر نایاب کو وقفِ عام کرتا،

چنانچہ سب سے پہلے مولوی خادم حسین عظیم آبادی کو یہ توفیق نصیب ہوئی اور انھوں نے ۱۳۱۰ھ میں مطبع علوی لکھنؤ میں اس کو چھپوانا شروع کیا، لیکن بڑی تمناؤں کے بعد جب کتاب چھپکر پریس سے نکلی تو بایں حال زبوں کہ کاغذ نہایت میلا اور کمزور، خط بیحد خراب اور بھونڈا، اور طباعت نہایت نامصاف، پھر غضب بالائے غضب یہ کہ ظاہری حسن وجمال سے محرومی کے ساتھ معنوی محاسن سے بھی وہ قطعاً عاری تھی، معلوم نہیں چھپوانے کے وقت کوئی صحیح نسخہ پیش نظر تھا یا نہیں یا تصحیح کا انتظام نہیں کیا گیا، یا کوئی دوسرا سبب تھا کہ چھپنے کے بعد کتاب اتنی مسخ اور اس طرح اغلاط سے پر تھی کہ ہر شخص کا اس سے کما حقہ نفع اٹھانا ناممکن تھا، تاہم مولوی خادم حسین مرحوم کو اللہ تعالےٰ جزائے خیر دے کہ ان کی کوشش وہمت سے یہ کتاب عام تو ہوگئی اور ہر کس وناکس کو اس سے کامل طور پر نہ سہی تو فی الجملہ انتفاع واستفادہ کا موقع تو مل گیا، چنانچہ جب تک یہ اڈیشن ملتا رہا تمام اہل ذوق اس سے اپنی علمی پیاس بجھاتے رہے،

بیس برس سے یہ اڈیشن بھی نایاب ہوچکا تھا، اور نہایت شدت سے ضرورت محسوس کیجارہی تھی کہ پہلے اڈیشن کی خرابیوں کو دور کر کے صحت وصفائی وپاکیزگی کے اہتمام کے ساتھ اس کتاب کا دوسرا اڈیشن نکلتا، کئی جگہوں سے یہ خبر سننے میں آئی کہ تخریجِ زیلعی کے دوبارہ طبع ہونے کا انتظار ہو رہا ہے،

مجلس علمی ڈابھیل کی مساعی جمیلہ کا اعتراف

لیکن کارکنانِ قضا وقدر نے یہ سعادت مجلس علمی (ڈابھیل) کیلئے مقدر کر رکھی تھی، دوسرے کے حصہ میں کیسے آتی،

این سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

کارکنانِ مجلس تمام احناف ہی کے نہیں، بلکہ حدیث کا ذوق رکھنے والے طبقہ کے شکریہ کے

مستحق ہیں، جنھوں نے وقت کی بڑی اہم ضرورت کا احساس کیا اور فن کی ایک عظیم الشان خدمت انجام دی، اگر ارکانِ مجلس اور کچھ نہ کرتے، صرف پہلے اڈیشن کی نقل ہی چھپوا دیتے تب بھی وہ ہر طرح ہمارے شکریہ کے مستحق تھے، لیکن آپ کو یہ سنکر بے پایاں مسرت ہوگی اور آپ ان کے شکریہ پر مجبور ہوں گے، کہ انھوں نے صرف اتنا ہی نہیں کیا بلکہ پہلے ہزاروں روپئے صرف کر کے جید ومستند عالموں سے پوری کتاب کی تصحیح اور اس کا تحشیہ کرایا، اصل کتاب میں متداول کتابوں کی جو حدیثیں ہیں ان کو ان کتابوں میں تلاش کرا کے حاشیہ میں جلد اور صفحات کے حوالے درج کرائے، پھر دو جواں ہمت جواں عمر عالموں کو اہتمام ونگرانی کے ساتھ اس کتاب کو طبع کرانے کیلئے مصر بھیجا، وہاں ان کو خوش قسمتی سے تخریج زیلعی کا وہ نسخہ ہاتھ آگیا جو حافظ ابن حجر کے مطالعہ میں رہ چکا تھا اور جابجا ان کے قلم سے اس میں تصحیحات بھی موجود تھیں، ان حضرات نے اپنے نسخہ کا اس سے مقابلہ کیا، اس کے بعد انھوں نے راحت طلبی کا شیوہ اختیار نہیں کیا، بلکہ تصحیح کتاب کے بلیغ اہتمام کے پیش نظر اور مزید اطمینان کی خاطر مصر کے عہد حاضر کے سب سے بڑے وسیع النظر عالم اور فن حدیث ورجال کے ماہر علامہ زاہد کوثری کی نظر سے جدید اڈیشن کے مطبوعہ فرمے گذرائے، اور جو اغلاط رہ گئے تھے، ان کا استدراک لکھوا کر بطور ضمیمہ کتاب میں شامل کیا، یہی اہتمام کاغذ کی عمدگی اور طباعت کی خوبی کا ہے کہ کتاب کی ظاہری صورت ہی دیکھکر دل خوش ہوجاتا ہے، اس اہم علمی خدمت پر کارکنانِ مجلس ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں، اور ہم ان کی خدمت میں بصمیم قلب پرخلوص ہدیہ تبریک وتہنیت پیش کرتے ہیں، اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ رب العزت ان کی ہمتوں میں برکت عطا فرمائے، ان کی علمی خدمتوں کا بہترین صلہ ان کو دے، اور علم دین کے لئے اس طرح کے مساعی جمیلہ کی مزید توفیق ان کو عنایت فرمائے،

المنتظم لابن جوزی

علامہ ابن جوزی بغدادی المتوفی ۵۹۷ھ کی تصنیفات میں ان کی تاریخ المنتظم فی تاریخ الملوک والامم کی اہمیت اہل علم پر روشن ہے، مدت سے اس کی پوری جلدوں کی تلاش جاری ہے، یورپ کے قدرشناسوں نے بھی اس کے حصول اور طبع و اشاعت کی تحریکیں اور کوششیں کئی دفعہ کیں، مگر یہ فخر دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن کیلئے مقدر تھا کہ وہ اس نادر کتاب کے اجزاء فراہم کرے، اور تصحیح و تحشیہ کے بعد شائع کرے، چنانچہ ۱۳۵۷ھ میں اس نے اس کی پانچویں جلد کا دوسرا حصہ اور چھٹی جلد پوری شائع کی،

علامہ ابن جوزی کی یہ تاریخ، تاریخ طبری کی طرح آغاز اسلام سے لیکر چھٹی صدی ہجری کے واقعات و حوادث پر مشتمل ہے، ہر سال کا عنوان باب ہے، اس کے نیچے اس سال کے پورے واقعات وہ لکھتے ہیں، مگر چونکہ مصنف ایک محدث ہیں اس لئے واقعات سے زیادہ علماء اور اکابر کے حالات اور وفیات کا تذکرہ پوری تفصیل سے کرتے ہیں، ساتھ ہی انکی تصنیفات اور روایات اور جرح و تعدیل سے بھی مختصر بحث فرماتے ہیں،

ان دونوں شائع شدہ جلدوں کے اصلی نسخے قسطنطنیہ اور برلین کے کتبخانوں میں ملے، مشہور محقق و فاضل مستشرق کرنکو نے ان نسخوں کے مقابلہ اور تصحیح سے اپنا نسخہ مرتب کر کے دائرۃ المعارف کے سپرد کیا، دائرہ نے مزید تصحیح اور تحشیہ کے بعد انکو چھاپکر شائع کیا،

ان میں پانچویں جلد ۲۵۷ھ سے ۲۸۴ھ تک کے واقعات اور حالات پر مشتمل ہے، افسوس ہے کہ یہ حصہ شروع سے ناتمام ملا ہے، چھٹی جلد ۲۸۵ھ سے شروع ہو کر ۳۴۹ھ پر تمام ہوئی ہے، کتاب کی پہلی، دوسری، تیسری اور چوتھی جلدیں ابھی تک نہیں ملی ہیں، خدا کرے کہ اس کتاب کے پورے حصے مل جائیں، کہ اہل علم کے ہاتھوں میں تاریخ طبری کے بعد تاریخ اسلام کا دوسرا ماخذ بھی آجائے،

تاریخ اسلام کے قدرشناسوں کو دائرۃ المعارف کا ممنون ہونا چاہئے کہ اس کی بدولت وہ ذخیرہ ہماری نگاہوں کے سامنے آرہا ہے، جس کے ایک نظر دیکھنے کے لئے ہمارے بزرگوں کی آنکھیں ترستی تھیں،

"س"

مطبوعات جدیدہ

تفسیر سورۂ والتین - مولانا حمید الدین فراہی، مترجمہ مولانا امین احسن صاحب اصلاحی تقطیع چھوٹی ضخامت [illegible] صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہترین، قیمت ۶ر، پتہ: - مکتبۂ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح، سرائمیر اعظم گڈھ،

ترجمان القرآن مولف کا یہ رسالہ ان کے تمام تفسیری، تحقیقی و وجدانی لطائف و نکات کا حامل ہے، مولف کے نزدیک اس سورہ کا مقصود اعمال کی جزاء و سزا اور بعثت محمدی کا اثبات ہے، اس تاویل کو ماقبل و مابعد کی سورتوں کے مضامین، کلام اللہ کی مختلف آیتوں، تورات و انجیل کے بیانات اور دوسرے شواہد کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے، پہلے سورہ کے الفاظ کی لغوی تحقیق و تشریح، جملوں کی تاویل اور ان کی ترکیب کا حل ہے، اس کے بعد اصل مقصود پر بحث ہے، کہ خدا نے تین، زیتون، طور سینین اور بلد امین کی کیوں قسم کھائی، اور اس کو سورہ کے مقصود سے کیا معنوی تعلق ہے، اس سلسلہ میں پہلے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ تین اور زیتون مقام کے نام ہیں، اور ان کے محل وقوع کی تعیین کی گئی ہے، پھر ان کی قسم کھانے کے اسباب اور قرآن، توریت و انجیل کے بیانات سے ان مقاموں کا سزا و جزاء اور بعثت محمدی سے تعلق دکھایا گیا ہے، کہ ان چاروں مقاموں پر سزا و جزاء اور ظہور رحمت کے نہایت عظیم الشان واقعات پیش آچکے ہیں، اور یہیں سے بعثت محمدی کی تمہید شروع ہوئی، شیطان کے ورغلانے سے حضرت آدمؑ کی غلطی اس کی سزا، پھر اس سے رہائی، اور خلعت خلافت سے سرفرازی، طوفان نوح کا عذاب، اس سے کشتی نوح کی نجات کے واقعات جبل تین پر پیش آئے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آخری زندگی کے حوادث، بنی اسرائیل کی سرکشی کی سزا میں شریعت الٰہی کی منصب داری سے ان کا عزل اور حضرت

ابراہیم علیہ السلام کی مقبولیت کے صلہ میں ان کی اولاد میں اس منصب کا انتقال وغیرہ کے واقعات کوہ زیتون پر پیش آئے، فرعون کے مظالم سے بنی اسرائیل کی رہائی، اور ان کو شریعت کی امانت طور سینا میں سپرد ہوئی، حضرت ابراہیمؑ کی آزمایش اور ان کی قربانی کے صلہ میں ان کی اولاد کی بر و مندی اور اس میں نبوت کے سلسلہ کی بنیاد بلد امین میں پڑی، اور یہیں سے خاتم الانبیا، کا ظہور ہوا، اسطرح ان چاروں مقاموں پر سزا و جزا، اور انتقام و رحمت کے عظیم الشان واقعات کا ظہور ہوا، ان واقعات کے ساتھ تین زیتون اور سزا و جزا، و بعثت محمدی میں اور بہت سی معنوی مناسبتیں دکھائی گئی ہیں، پھر سورہ کے مقصود سے لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم اور اس کے بعد کی آیتوں کا تعلق بتایا گیا ہے، کہ انسان کے تین مدارج ہیں، اور انھیں مدارج کے لحاظ سے اس پر سزا و جزا، اور رحمت کے نتائج مترتب ہوتے ہیں، مثلاً پہلے درجہ میں خدا نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا، یعنی حسن خُلق کے ساتھ حق و باطل اور ظلمت و نور میں امتیاز کے لئے عقل بھی عطا کی، کہ بغیر اس کے نہ احسن تقویم کی تکمیل ہو سکتی تھی اور نہ سزا و جزا کا معاملہ پیش آسکتا تھا، پھر دوسرے درجہ میں نافرمانی کی وجہ سے وہ ادنیٰ درجہ پر پہنچا دیا گیا، تیسرے درجہ میں توبہ و استغفار کے بعد رحمت کے دروازے اس کے لئے کھلے رکھے گئے، ان مدارج کے پیش نظر فما یکذبک بعد بالدین کا تعلق خود بخود واضح ہو جاتا ہے، ان مباحث میں جا بجا بعثت محمدی کے اشارے موجود ہیں، آخر میں کلام اللہ کی سورتوں سے اس کا مستقل اثبات بھی کیا گیا ہے، اس تفسیر میں یہ بات خاص طور سے قابل لحاظ ہے کہ سزا و جزا کو ظہور رحمت کا وسیلہ ثابت کیا گیا ہے یعنی ہر سزا میں رحمت کا تخم پوشیدہ ہوتا ہے، جس کے بعد رحمت کا پودا اگتا ہے،

صراط الحمید جلد اول - مرتبہ مولوی حاجی الیاس احمد صاحب برنی، ناظم دار الترجمہ، تقطیع متوسط ضخامت ۵۰۳ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت اوسط، قیمت ؏

پتہ :- کمال احمد صاحب فاروقی، دار السلام، حیدر آباد، دکن،

مولوی حاجی الیاس احمد صاحب برنی ۱۳۴۵ھ میں فریضہ حج اور مدینہ طیبہ کی زیارت سے مشرف ہوئے تھے، اس سلسلہ میں انھوں نے شام و عراق کے تمام مقدس مقامات کی حاضری کی سعادت بھی حاصل کی تھی اسی زمانہ میں انھوں نے صراط الحمید کے نام سے ان مقامات کا سفرنامہ لکھا تھا، اب پندرہ سال کے بعد مزید ترمیم او اضافوں کے ساتھ اس کا دوسرا مکمل تر اڈیشن شائع کیا ہے، اس اضافہ میں مناسک حج میں خصوصیت کے ساتھ زیادہ جامعیت پیدا ہو گئی ہے، کتاب کے آخر میں اپنے اور رفقائے سفر کے دلچسپ حالات بڑھائے ہیں، اس سفرنامے کی اتنی جہتیں ہیں اور اس میں اتنے گوناگوں معلومات ہیں کہ اس تبصرہ میں اس کی تفصیل کی گنجایش نہیں، مختصر یہ ہے کہ یہ سفرنامہ حجاز، شام و عراق کے مقدس مقامات کا گائڈ بھی ہے، یہاں کے آسودگانِ خاک انبیا، و صلحا کا تذکرہ بھی، ان کے آثار و مشاہد کی تاریخ بھی، حج و زیارت کا معلم بھی مناسک و مسائل حج کی کتاب بھی، غرض ایک زائر و سیاح کیلئے ان مقامات کی سفری سہولیت، جغرافی، تاریخی اور مذہبی جن جن قسم کے معلومات کی ضرورت ہے سب اس میں موجود ہیں، یوں تو ان مقامات مقدسہ کے سفرنامے لکھے جاتے ہیں، لیکن اس سفرنامے میں جو جامعیت ہے وہ مشکل ہے کسی دوسرے سفرنامے میں مل سکتی ہے، اس کی سب سے بڑی خصوصیت بلکہ اس کی روح اس کی باطنی اور وجدانی کیفیت ہے، مولف ماشاءاللہ صاحب دل بھی ہیں، اور صاحب قلم بھی، اور قلم بھی مصور واردات و وجدانیات، اور حاضری کیسے کیسے پاک آستانوں اور عظمت و جلال اور شفقت و رحمت کے درباروں کی، میکدۂ الفت و محبت کا طواف، عجز و نیاز کی نذر، فیوض و برکات کی بارش، اس لئے سطر سطر سے مستی جھلکی پڑتی ہے، اور یہ اختیار باطنی کیفیتیں زبان قلم پر آگئی ہیں، اس سفرنامے کا اصلی لطف تو اس بادہ کے لذت آشنا ہی اٹھا سکتے ہیں لیکن اس کے اثر سے ظاہر بیں تماشائی بھی محروم نہیں رہ سکتے، عام زائرین کیلئے یہ سفرنامہ معلومات کا گائڈ ہے، اور صاحب دل اشخاص کے لئے عشق و محبت کی داستان، مستی میں لغزش ضروری ہے، جس کا خفیف اثر بعض مقامات پر نظر آتا ہے، لیکن لطف بیان میں ادھر ذہن منتقل نہیں ہونے پاتا،

دیوانِ بیدار

مرتبہ جناب محمد حسین صاحب محوی صدیقی، لکچرار مدراس یونیورسٹی، تقطیع بڑی، ضخامت ۱۷۸ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت معمولی، مجلد، قیمت مرقوم نہیں، غالباً مصنف سے ملے گا،

میر محمدی بیدار دہلوی المتوفی ۱۲۰۹؁ھ میر و مرزا کے دور کے باکمال شاعر اور ممتاز اساتذہ میں تھے، اردو زبان کی صحت و صفائی میں ان کا بھی حصہ ہے، فارسی میں بھی کہتے تھے، لیکن وفات کے بعد ایسے گمنام ہوئے کہ شعر و شاعری کی دنیا ہی سے کھو گئے، محض تذکروں میں ان کے مختصر حالات ملتے ہیں، بیدار صاحبِ دیوان تھے، اردو میں ان کا پورا دیوان موجود ہے، فارسی میں بھی تھوڑا کلام ہے، انکے دیوان کے قلمی نسخے کمیاب تھے، اردو زبان کے پرانے خادم مولوی محمد حسین صاحب صدیقی لکھنوی شکریہ کے مستحق ہیں، جنھوں نے دیوان بیدار کے دو نسخوں کو تلاش کر کے تصحیح و مقابلہ کے بعد اسے اہتمام کے ساتھ شائع کیا، دیوان کے شروع میں مرتب کے قلم سے ایک مبسوط مقدمہ ہے، اس میں بیدار کے حالات اور ان کے کلام پر مفصل تبصرہ ہے، اردو دیوان کی ضخامت ۱۳۳ صفحے ہے، اور فارسی کلام میں کل ۴۴ غزلیں، چند قصائد، رباعیات، تاریخیں اور بعض دوسری نظمیں ہیں، بیدار اپنے عہد کے ممتاز اساتذہ میں تھے، اس لئے انکے کلام میں اس دور کے اساتذہ کے کلام کی تمام خصوصیات، زبان کی صحت و صفائی، سادگی، گھلاوٹ، طرز ادا کی خوبی، باطنی واردات، جذبات کی سچی ترجمانی، تصوف، درد و اثر وغیرہ سب موجود ہیں، فارسی کا کلام گو مختصر ہے، لیکن اس سے بھی مشق و پختگی نمایاں ہے، فاضل مرتب نے دیوان کی ترتیب و تصحیح میں کافی محنت اٹھائی ہے، قلمی نسخوں کے علاوہ مختلف تذکروں سے بھی دیوان کی ترتیب میں مدد لی ہے، حاشیہ میں الفاظ کے اختلافِ نسخ کے ساتھ دیوان اور تذکروں کے اشعار کی کمی بیشی اور متروکات کی بھی وضاحت کر دی ہے، محوی صاحب نے یہ دیوان شائع کر کے اردو زبان کے ایک قابل قدر سرمایہ کو محفوظ اور عام کر دیا ہے،

انبیائے کرام کے دو دشمن

مؤلفہ جناب غلام نبی صاحب بی اے، تقطیع چھوٹی، ضخامت

۴۰ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت معمولی، قیمت ۴ر، پتہ: مکتبۂ اسلامیہ، اندرون موچی دروازہ، لاہور،

اس رسالہ میں مولف نے دکھایا ہے کہ انبیائے کرام کے سب سے بڑے دشمن دو تھے، سرمایہ دار اور حکامِ وقت، اور انبیائے کرام انھیں دونوں کا زور توڑنے اور ضعیف و ناتواں مخلوق کو ان کے پنجۂ ظلم سے چھڑانے کیلئے مبعوث ہوئے تھے، اس کے ثبوت میں انھوں نے اپنی بصیرت کے مطابق کلام اللہ اور پیغمبروں کے واقعاتِ زندگی سے شواہد پیش کئے ہیں، مولف کا یہ خیال تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ نتائج کے لحاظ سے ایک حد تک صحیح ہے، لیکن کلیہ کی صورت میں اور نقطۂ نظر کے اعتبار سے غلط، اس میں شبہہ نہیں کہ ان دونوں جماعتوں کی اکثریت نے پیغمبروں کی مخالفت کی، لیکن اس لئے نہیں کہ وہ پیغمبر یا داعیِ حق تھے، بلکہ اس لئے کہ ان کی دعوت سے ان کے اقتدار کو صدمہ پہنچتا تھا، پھر ان دونوں طبقوں میں ایسے حق پرست بھی تھے جنھوں نے پیغمبر کی دعوت پر لبیک کہا، مثلاً حضرت عثمان غنیؓ، اور حضرت زبیرؓ اور نجاشی شاہ حبش، قیصر روم گو تاج و تخت کی طمع میں قبولِ اسلام کی دولت سے محروم رہا، لیکن دل سے اس نے بھی آنحضرت صلعم کی نبوت کی تصدیق کی، یہ بھی صحیح نہیں کہ پیغمبروں کی بعثت کا مقصد ان دونوں طبقوں کو مٹانا تھا، ان کا اصلی مقصد توحید اور دینِ حق کی دعوت تھا، اس سلسلہ میں اور فرائض بھی ان سے متعلق تھے، جن میں ایک عدل کا قیام اور ظلم کا استیصال بھی تھا، اس سلسلہ میں انھوں نے سرمایہ داری کی برائیوں اور ظالم حکمرانوں کے ظلم کو بھی دور کیا،

تذکرہ خاصانِ خدا

مترجمہ مصطفائی بیگم صاحبہ، تقطیع اوسط، ضخامت ۲۳۳ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہترین، قیمت مجلد ۱۲ر، پتہ: مصطفائی بیگم لیڈی کمشنر خزانۂ عامرہ سرکارِ عالی حیدرآباد دکن،

یہ تذکرہ شاہجہانی عہد کے ایک قلمی فارسی تذکرہ الاولیا کا مخلص ترجمہ ہے، اس میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے لیکر شیخ والا شاہ رحمۃ اللہ علیہ المتوفی ۱۰۲۳؁ھ بن شیخ نظام نارنولی تک سلسلۂ چشتیہ کے ۲۷ بزرگوں کے حالات ہیں، عام تذکرۃ الاولیا کی طرح اس میں بھی ان بزرگوں کے سبق آموز حالات، سلوک و مجاہدات اور

کشف و کرامات کے واقعات ہیں، کتاب کے شروع میں مولوی حامد خاں صاحب ہندی کے قلم سے تصوف کی حقیقت پر ایک مقدمہ ہے جس میں اسلامی تصوف کو پیش کرکے اس کے متعلق بعض غلط فہمیوں کو دور کیا گیا ہے، اور مولانا سید حبیب جعفر بن حبیب احمد عید روسی کے قلم سے عربی میں ایک مختصر دیباچہ ہے، ترجمہ صاف اور سلیس ہے، جو لوگ اس قسم کی کتابوں سے دلچسپی رکھتے ہیں، ان کے ذوق کا اس تذکرہ میں کافی سامان ہے،

عصمت کی کہانی۔ مولفہ جناب ازق الخیری صاحب تقطیع بڑی ضخامت ۹۰ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت ۸ر پتہ:۔ عصمت بک ڈپو، دہلی،

یہ اڈیٹر عصمت کے قلم سے، رسالہ عصمت دہلی کے مختلف دوروں کی سرگذشت ہے، اس کے ضمن میں تمدن، جوہر نسواں اور بنات وغیرہ ان تمام رسالوں کے حالات جن کا تعلق مولانا راشد الخیری مرحوم سے تھا، اور انکی نسوانی و ادبی خدمات اور اس کے لئے ان کے ایثار اور قربانیوں کی پوری تفصیل آگئی ہے،

خبطی۔ مولفہ جناب محمد علی صاحب ردولوی تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۱۹ صفحے کاغذ، کتابت و طباعت معمولی، قیمت ۸ر پتہ:۔ انوار بک ڈپو لکھنؤ،

اس افسانہ میں طالبعلمی کی زندگی کے بعض واقعات کو افسانہ کی شکل میں دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا ہے، اسکا خلاصہ یہ ہے کہ مہندر، سری، اقتدار اور سرلا ہم سن طالبعلم ہیں، مہندر معمولی گھرانے کا لڑکا ہے لیکن ہونہار و شایستہ اور سری دولتمند دہقانی خاندان کا بے عقل و بے شعور لڑکا ہے، سرلا ایک متمول گھر کی تعلیم یافتہ اور خوش مذاق لڑکی ہے، اسمیں اور مہندر میں مؤانست ہو جاتی ہے لیکن سرلا کا باپ اسکی مرضی کے خلاف سری سے اسکی شادی کرنا چاہتا ہے، سرلا انکار کرتی ہے اور مہندر سے شادی کر لیتی ہے، ہونہار مولف نے طالبعلمی کی زندگی کے شوخ و شریر واقعات کی آمیزش سے اس افسانہ کو کافی دلچسپ بنا دیا ہے، مہندر کی اعلیٰ سیرت کی تصویر اور سری کی مضحک حرکتوں کا خاکہ بہت دلچسپ ہے، گو افسانہ سے کہیں کہیں نو مشقی ظاہر ہوتی ہے، لیکن ہونہار مولف میں افسانہ نگاری کی کافی صلاحیت ہے،

"م"

جلد ۴۶ ماہ جمادی الثانی و رجب المرجب ۱۳۵۹ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۴۰ء عدد ۲

مضامین